محمد

مُحسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نعیم صدیقی

محسنِ انسانیت

ترتیب مضامین

دیباچہ .... سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تقریظ .... جناب ماہر القادریؒ

.... ﴿ابواب﴾ ....

پیغام ۔ نصب العین اور تاریخی مقام

شخصیت ایک نظر میں

محسنِ انسانیت ..... مکی دور میں

محسنِ انسانیت ..... مدنی دور میں

واقعات سیرت پاک کی ترتیب زمانی

والیات و تقدمات

تفصیل مضامین

ا۔ پیغام۔ نصب العین اور تاریخی مقام......(مقدمہ)

بنی نوع انسان کا نجات دہندہ

وقت، مقام اور انسانی مواد

انقلابی کلمۂ حق

حضورؐ کا نصب العین

ایک دن......ایک تحریک

زندگی کی ہم آہنگی

انقلاب کی روح

نیا انسان

محسنِ انسانیت کا عظیم ایثار

ہم کہاں کھڑے ہیں

مطالعہ سیرت کا نقطہ نظر

بنام مغرب

۲۔ شخصیت ایک نظر میں ۔۔۔۔۔ (تعارف)

ایک جھلک

ایک جامع لفظی تصویر

لباس

وضع قطع اور آرائش

رفتار

تکلم

خطابت

عام سماجی رابطہ

خالص نجی زندگی

اکل و شرب

نشست و برخاست

بشری حاجات

سفر

جذبات

ذوق مزاح

تفریحات

چند متفرق ذوقیات

اخلاق

۳۔ محسنِ انسانیت.....مکی دور.....(مدوجزر)

وہ نوجوان

قریش کے وجوہ مخالفت

چند شرارے

دعوت کا خفیہ دور

دعوت عام

اشتعال انگیزی

گندا پروپیگنڈا

کٹ حجتیاں

دلائل

غنڈہ گردی

حمایتوں کو توڑنے کی کوشش

منظم منفی محاذ

الٹا اثر

فنون لطیفہ کا محاذ

سودا بازی کی کوششیں

تشدد اپنے جوبن پر

ہجرت حبشہ

عمر مفتوح ہو جاتے ہیں

تحریک اسلامی کی نئی جست

اسلام حمزہ

مقاطعہ اور نظر بندی

سال اندوہ

طائف میں دعوت حق

نوید سحر

الوداع اے مکہ

۴۔ محسن انسانیت۔۔۔۔۔مدنی دور (تاریخ موڑ مڑتی ہے)

مدینہ کی مختلف فضاء

تحریک اسلامی مدینہ میں

بیعت عقبہ اولی

دو لیڈروں کا قبول اسلام

بیعت عقبہ ثانیہ

مدینہ میں تحریک کا نیا مدوجزر

تحریک کا نیا مرکز

مدینہ۔۔۔۔۔ ہمہ تن انتظار

تعمیری اقدامات

اسلامی ریاست کی تاسیس

نظام مواخات

پھر وہی کشمکش

یہود کا تاریخی پارٹ

سمجھاؤ

مناظرانہ سوالات

طوفان اٹھ پڑا

بدتمیزیاں اور بیہودگیاں

مضحکہ انگیز مطالبہ

یہود کا طرز عمل

پانچواں کالم

مفسدانہ پروپیگنڈا

ہوسِ منصب کا الزام

الزام..... مذہبی شعائر کی بے حرمتی الزام......

دین کے پردے میں نفسانیت

گندا بہتان

فتنہ آرائی

داخلی پیچیدگیاں

حضرت عائشہؓ کی آپ بیتی

تبصرہ، تجزیہ اور تزکیہ

قانون حرکت میں آتا ہے

عدو شرے برانگیزد

شر انگیزیاں

نظام انصاف میں رخنہ اندازی

خانۂ نبوت میں چنگاریاں

قتل کی سازشیں

ہلاکت انگیز غداریاں

قریش کی انتقامی حرکات

تلواروں کی چھاؤں میں

اسلامی نظریۂ جہاد

قرآن کا فلسفۂ

جنگ

تم نہیں یا ہم نہیں

مدینہ کی جنگی کارروائیوں کی نوعیت   حضورؐ کا منصوبہ

جنگ

ایک وسیع غلط فہمی

قریش کی جارحانہ ذہنیت

مدینہ کا دفاعی نظام

حضورؐ کی دفاعی تدابیر

طلایہ گردی کا نظام اور اس کے مقاصد

دو اتفاقی محرکات

قریش کی سہ گانہ ضروریات

قریشی قافلہ تجارت جنگ کا پیش خیمہ تھا

معرکہ بدر کا نتیجہ

دو قوتوں کا فرق

معرکۂ بدر کے بعد

دوسرا بڑا معرکہ (احد)

معرکۂ احد کے چند پہلو

احد کے بعد

تیسرا بڑا معرکہ (خندق)

غزوۂ خندق کے اہم نکات

معرکۂ خندق سے فتح مکہ تک

چوتھا بڑا معرکہ (فتح مکہ)

چند اہم اشارات

فتح مکہ کی تکمیل

فتح مکہ کے بعد

دو غیر ملکی لڑائیاں

تبصرہ

اور اجالا پھیلتا ہی گیا

دلیل کی قوت

خیر خواہانہ اپیل

تنقید

مسلم کردار کی اخلاقی قوت

معاہدانہ روابط

بیعت عقبہ

دستوری معاہدہ

متفرق قبائل سے معاہدات

معاہدہ حدیبیہ

عمرۃ القضا

جہاد کا اثر رائے عام پر

حکومت خود معلم انقلاب تھی

عوام کی معاشی فلاح

قائد ریاست کے وسیع تعلقات

عوام خود آگے بڑھتے ہیں

بین الاقوامی دعوت کا آغاز

ردعمل کی آخری لہر

تحریک اسلامی کا اجتماع عظیم

محسن انسانیت کے بعد

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

ضمیمے......

کام ابھی باقی ہے

واقعات سیرت پاک کی ترتیب زمانی

اولیات و تقدمات

تحریک اسلامی کا عددی نشوونما

رسول پاکؐ

چند کتب حوالہ

اشاریہ محسن انسانیتؐ

شخصیات

اماکن

عام

کتب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام کی تبلیغ و تعلیم و تفہیم کا واسطہ بنایا بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تا کہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لئے انسانی فرد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم وملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجئے تو وہ ایک کشتی ہے ناخدا کے بغیر جسے لے

کر لا ڈی مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں

منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب سے الگ

کر دیجئے تو خدا کا راستہ پانے کی بجائے آدمی ما خدا ہی کو خدا بنا

بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پچھلی قومیں دیکھ چکی

ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا اور صرف

کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لئے

لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں۔ حتیٰ کہ آخر کار خود

انہیں بھی وہ گم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے

نبی کا دامن پکڑا اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا۔ نتیجہ

یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے

باز نہ رکھ سکی۔

پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو

نعمت اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں جو ازل سے چلے

آ رہے ہیں ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآن پاک کی

صورت ہی میں مل سکتا ہے دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد

عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ

کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو

اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے۔ ان دونوں کو ایک

دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا، اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ

فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک مشن

رکھتے ہیں۔ ایک مقصد و مدعا کو لئے ہوئے آئے ہیں اس لئے

ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو

کس حد تک سمجھتے ہیں۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو قرآن

عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک واقعات و حوادث کا ایک

مجموعہ ہے۔ آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد

سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ ؐ کے عہد کے متعلق
صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر روح
دین تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں
بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لئے قرآن اتارا گیا اور
محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی علمبرداری کے لئے کھڑا کیا
گیا۔ اس مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم
صحیح، اور جتنا وہ ناقص ہوگا اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی صلی
صاحبہا الصلوٰۃ والسلام، دونوں ہی بحر ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان
یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کر لے تو
اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی
جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ
سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روح دین تک
رسائی پائے۔

ان سطور سے میرا مقصد نعیم صدیقی صاحب کی کتاب پر کوئی تقریظ یا تنقید لکھنا نہیں ہے، وہ جتنی اور جیسی داد کی مستحق ہے، انشاءاللہ ناظرین خود دیں گے اور اس کے عیب و صواب سے بھی علم و بصیرت والے ناواقف نہ رہیں گے۔ میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ نعیم صاحب نے ایک طویل مدت تک محنت شاق برداشت کر کے سیرت پاک کے چشمۂ صافی سے خلق خدا کو سیراب کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ لے کر میں بھی کسی حد تک سعادت کا مستحق بن سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی کتاب پڑھنے سے پہلے ہر ناظر اچھی طرح سمجھ لے کہ سیرت پاک کا مطالعہ اس کو کس مقصد کے لئے اور کس نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مجھے امید ہے کہ نعیم صاحب کی محنت سے لوگ زیادہ بہتر طریقہ سے مستفید ہو سکیں گے۔

ابوالاعلیٰ

لاہور ۔ ۱۸/ مئی ۱۹۶۰ء

Source: www.prophetmuhammadforall.org

تقریظ

محترم جناب ماہر القادری صاحب

مدحت رسولؐ میں فارسی شعر کا یہ مصرعہ:......

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ضرب المثل بن چکا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نعت و منقبت کا عنوان اور مدحت رسولؐ کا موضوع اختصار و اجمال نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ شرح و اطناب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مبارک ذکر کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے بعد بھی دل کی سیری نہیں ہوتی، اور جی چاہتا ہے کہ یہ مقدس داستاں دراز تر ہوتی چلی جائے۔

زبان و قلم کی سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ یہ

سیرت نبیؐ کے اعلان و اظہار کا ذریعہ قرار پائیں اور سالہا سال کی زمزمہ خوانی اور ہزاروں صفحوں کی کتابت و املاء کے بعد بھی وجدان و ضمیر اس عجز و واماندگی کا اعتراف کریں کہ: ۔

ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

غالبؔ نے روح القدس کی تائید کے بعد ہی اتنا سچا شعر کہا ہے: ۔

غالبؔ ثنائے خواجہؐ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

کس کی مجال ہے جو خلاصۂ کائنات فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ و التحیات کی مدحت سرائی اور سیرت نگاری کا حق ادا کر سکے، یہ غلط دعویٰ نہ کسی زبان سے نکل کر فضا میں پھیلا اور نہ کسی قلم نے اسے صفحۂ قرطاس پر ثبت کیا۔ اس بارگاہ قدس میں جس نے بھی لب کشائی کی تو اس کا مقصود حصول سعادت کے

سوا اور کچھ نہ تھا۔

سیرت ابن اسحاق کے شارح عبدالرحمٰن سہیلی (وفات ۵۸۱ھ) کی "روض الانف" ہو یا حافظ عبدالمومن دمیاطی (۷۰۵ھ) کی "سیرت دمیاطی" گازرونی اور مغلطائی ..... کی سیرت پہ کتابیں ہوں یا حافظ ابن الجوزی کی "شرف المصطفیٰ"۔ سیرت ابن عبدالبر ہو یا ابن سید الناس کی "عیون الاثر" قسطلانی کی مواہب لدنیہ اور اس کی شرح "زرقانی علی المواہب" ہو یا "سیرت حلبی" شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت پہ تالیفات ہوں یا قاضی سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین"! ان تمام سیرت نگاروں کی کوششیں مستحق تبریک اور لائق تحسین ہیں۔ ان بزرگوں نے تاریخ و سیرت کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مگر یہ کسی نے نہیں کہا کہ سیرت نگاری کا ہم نے حق ادا کر دیا، یا ہماری کتاب سیرت کے موضوع پہ "حرف آخر" کی حیثیت رکھتی ہے!

سیرت کی تمام کتابیں ثقاہت و صحت کے اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہیں۔ کسی کسی سیرت نگار نے تو چھان پھٹک کے بغیر ہر رطب و یابس کو اکٹھا کر دیا ہے یہاں تک کہ موضوع روایتوں کو نقل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اسی قسم کی غلط روایتوں کو عام مسلمانوں میں قبول حاصل ہوا اور میلاد کی محفلوں میں عام طور پر مسلمان انہی "موضوعات" کو سن کر جھومتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کے مشہور اہل قلم جناب نعیم صدیقی نے بھی سیرت کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بارگاہ رسالت میں اپنی بساط کے مطابق نذر عقیدت پیش کر کے دین و دنیا کی سعادت حاصل کی ہے! یہ بہت بڑا شرف ہے جس کی توفیق اللہ تعالٰی کے فضل سے انہیں نصیب ہوئی ہے۔ ایک ایسا "شرف" جس پر رشک کیا جا سکتا ہے! اس شرف میں زور بازو سے زیادہ اللہ تعالٰی کی رحمت و عطا کا ہاتھ ہے۔

اس دنیا میں مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن کے زبان و قلم اسلام کی ترجمانی کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ نعیم صدیقی چاہتے تو اپنے قلم سے فلمی کہانیاں اور رومانی افسانے لکھ کر بہت کچھ شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے مگر ان کے قلم کو بدو شعور اور آغاز تصنیف و تالیف ہی سے طہارت میسر آئی ہے اور وہ ان آلودگیوں سے دور رہے ہیں، جن پر بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کے محل قائم ہیں! نعیم صدیقی نے سستی شہرت اور ناجائز و مشتبہ دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے حق کی خاطر قید و بند کی سختیاں بھی اٹھائی ہیں اور معاش کی تنگی سے بھی ان کا سابقہ پڑا ہے، ان کڑی آزمائشوں نے ان کی زندگی میں نکھار، ان کی زبان میں تاثیر اور ان کی تحریر میں سوز پیدا کر دیا ہے۔

"محسن انسانیت" میں نعیم صدیقی کے قلم کی طہارت،

فکر کی پاکیزگی، دل کا سوز اور دینی شغف پوری طاقت کے ساتھ ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایک سطر محبت رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی اور ایک ایک ورق پر عقیدت کے لعل و گہر جگمگ کرتے ہوئے! ظاہر ہے کہ کوئی سیرت نگار واقعات میں تو اپنی طرف سے اضافہ کر نہیں سکتا، جہاں تک واقعات کے قلم بند کرنے کا تعلق ہے ہر سیرت نگار کی حیثیت مصنف (Author) کی نہیں۔ مؤلف (Compiler) کی ہوتی ہے۔ سیرت نگار کی شخصیت کے جوہر واقعات کے انتخاب و ترتیب اور ان کو خاص اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کھلتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب نعیم صدیقی کے ادب و انشاء، اسلوب نگارش، انداز فکر، دینی رجحان، مورخانہ بصیرت اور ذوق انتخاب کا نہایت حسین تعارف ہے!

سیرت نگاری کا وہ ذوق اور عقیدت کا وہ جوش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مافوق الانسان" کی حیثیت سے پیش کیا

جائے۔ جہاں سارا کام خرقِ عادت اور معجزوں کے زور سے چلتا ہو اور زندگی کا یہ رنگ دیکھ کر آدمی اطاعت کی ہمت ہی نہ کر سکے۔

......مگر......

نعیم صدیقی عقیدت کے اس غلو کی خرابیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے سیرت مقدسہ کے واقعات کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے امکان بھر پوری کوشش کی ہے کہ سچے موتیوں کے ساتھ خزف ریزے نہ آنے پائیں جو واقعہ بھی ان کی کتاب میں درج ہو وہ درایت و روایت کی کسوٹی پر پورا پورا اترتا ہو...... اور اس "انسان کامل" کی پاک سیرت کے خط و خال پڑھنے والوں کے سامنے آئیں۔ جس کی اتباع و اطاعت "کشف و کرامت" کے بغیر کی جا سکتی ہے۔ اور جس کی مقدس زندگی دہشت ناک

نہایت دلکش و محبوب ہے!

نعیم صدیقی معجزات کے خدانخواستہ منکر نہیں ہیں مگر وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "خرق عادات" کے لئے نہیں بلکہ "انسانی عادات" کو مربوط اور متوازن بنانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے جس کا بہترین اور کامل ترین نمونہ خود حضور کی زندگی تھی۔

"محسن انسانیت" لالہ و گل کی طرح رنگین، آبشاروں کی مانند مترنم اور کہکشاں کی طرح روشن و تابناک ہے اس کی زبان میں بڑی سلاست و روانی پائی جاتی ہے اور اسلوب نگارش بہت دلکش اور بعض مقامات پر تو وجد آفریں ہے!

اردو زبان ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی جن اہل نظر اور ارباب علم کی نگاہ سے سیرت پر کتابیں گذری ہیں۔ وہ "محسن انسانیت" کو پڑھ کر اس کی انفرادیت کو ضرور محسوس کریں

گے۔ غیب کا حال تو اللہ کے سوا، اور کوئی نہیں جانتا۔ مگر میرا وجدان پیشن گوئی کر رہا ہے کہ اس کتاب کو انشاء اللہ قبول عام حاصل ہوگا۔

جناب نعیم صدیقی نے کاغذ پر جو نقوش بنائے ہیں، وہ انشاء اللہ دلوں پر منتقل ہوتے رہیں گے اور اس طرح ان کا نام اور کام باقی رہے گا!

ماہر القادری

کراچی۔ ۵/اکتوبر ۱۹۵۹ء

☆ ☆ ☆

مقدمہ

پیغام، نصب العین اور تاریخی مقام

پیشتر اس سے کہ ہم حضورؐ کی سیرت کا مطالعہ کرنے چلیں، ہمارے سامنے اس کام کا کوئی واضح تصور ہونا چاہیے جسے سرانجام دینے کے لیے محسنِ انسانیت تاریخ کی جنگاہ میں نمودار ہوتے ہیں اور عمر بھر ایک فیصلہ کن معرکہ سر کرنے میں گذار دیتے ہیں! حضورؐ کی زندگی ایک بین الانسانی مشن کی داستان ہے۔ وہ قرآن کے ابدی اصولوں کی تفسیر ہے جسے عمل کی زبان میں مرتب کیا گیا ہے! وہ اس مقدس پیغام کی تکمیل ہے جس کی مشعل آدم، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور جملہ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں روشن کرتے رہے ہیں۔

ہم سیرت پاک کو مربوط نہیں کر سکتے، واقعات کی توجیہہ نہیں کر سکتے، مطالعہ سیرت کا مقصد متعین نہیں کر سکتے اور اس سے جو کچھ ہمیں اخذ کرنا ہے وہ کچھ اخذ نہیں کر سکتے، تا وقتیکہ ہم حضور ؐ کے کام کی نوعیت، اس کے امتیازی پہلوؤں اور اس کے دائرہ کی وسعتوں کو پیش نظر نہ رکھ لیں۔

نبی نوع انسان کا نجات دہندہ :

تاریخ کے وسیع دائروں پر نظر ڈالیں تو اس میں ہمیں طرح طرح کے مصلحین دکھائی دیتے ہیں۔ شیریں مقال واعظ اور آتش بیان خطیب سامنے آتے ہیں، بہت سے فلسفہ طراز ہر دور میں ملتے ہیں۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کے انبوہ ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ جنگجو فاتحین کی داستانیں ہم پڑھتے ہیں، جماعتیں بنانے اور تمدن میں مدوجزر پیدا کرنے والوں سے ہم تعارف حاصل کرتے

ہیں۔ انقلابی طاقتیں نگاہوں میں آتی ہیں جنہوں نے نقشۂ
حیات بار بار زیر و زبر کیا ہے۔ رنگا رنگ مذاہب کی نیو ڈالنے
والے بکثرت سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کے داعی بھی
اسٹیج پر آتے رہے ہیں۔ کتنے ہی مقنن ایوان تہذیب میں جلوہ گر
رہ چکے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی تعلیمات ان کے کارناموں
اور ان کے پیدا کردہ مجموعی نتائج کو دیکھتے ہیں تو اگر کہیں خیر و
فلاح دکھائی دیتی ہے تو وہ جزئی قسم کی ہے۔ اس کی اثرات
زندگی کے کسی ایک گوشے پر ابھرتے ہیں۔ پھر خیر و فلاح کے
ساتھ طرح طرح کے مفاسد ترکیب پاتے ہوئے دکھائی دیتے
ہیں۔ انبیاءؑ کے ماسوا کوئی عنصر تاریخ میں ایسا نہیں دکھائی دیتا جو
انسان کو...... پورے کے پورے انسان کو...... اجتماعی انسان کو
...... اندر سے بدل سکا ہو۔ حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ
کی دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل
دیا۔ اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک،

مدرسے سے عدالت تک اور گھروں سے لے کر میدان جنگ تک
چھا گیا۔ ذہن بدل گئے، خیالات کی رو بدل گئی، نگاہ کا زاویہ
بدل گیا، عادات اور اطوار بدل گئے، رسوم و رواج بدل گئے۔
حقوق و فرائض کی تقسیمیں بدل گئیں، خیر و شر کے معیارات اور
حلال و حرام کے پیمانے بدل گئے۔ اخلاقی قدریں بدل گئیں،
دستور اور قانون بدل گیا، جنگ و صلح کے اسالیب بدل گئے۔
معیشت اور ازدواج کے اطوار بدل گئے اور تمدن کے ایک ایک
ادارے اور ایک ایک شعبے کی کایا پلٹ گئی۔ اس پوری کی پوری
تبدیلی میں جس کا دائرہ ہمہ گیر تھا، ایک سرے سے دوسرے
سرے تک خیر و فلاح کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ کسی گوشے میں شر
نہیں، کسی کونے میں فساد نہیں، کسی جانب بگاڑ نہیں۔ ہر طرف
بناؤ ہی بناؤ، تعمیر ہی تعمیر اور ارتقا ہی ارتقا ہے۔ درحقیقت محسن
انسانیت کے ہاتھوں انسانی زندگی کو نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اور
حضورؐ نے ایک نظام حق کی صبح درخشاں سے مطلع تہذیب کو

روشن کر کے بین الاقوامی دورِ تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

محسنِ انسانیت کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جبکہ پوری انسانیت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی ...... کہیں دورِ وحشت چل رہا تھا اور کہیں شرک اور بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا! مصر اور ہندوستان، بابل اور نینوا، یونان اور چین میں تہذیب اپنی شمعیں گل کر چکی تھی۔ لے دے کے فارس اور روم تمدنی عظمت کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ رومی اور ایرانی تمدنوں کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی۔ مگر ان شیش محلوں کے اندر بدترین مظالم کا دور دورہ تھا اور زندگی کے زخموں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ بادشاہ خدا کے اوتار ہی نہیں، خدا بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جاگیردار طبقوں اور مذہبی عناصر کی ملی جھگت قائم تھی۔ روم اور ایران کے دونوں خطوں میں اس گٹھ جوڑ نے عام انسان کا گلا اچھی طرح دبوچ رکھا

تھا۔ یہ لوگ ان سے بھاری ٹیکس، رشوتیں، خراج اور نذرانے
وصول کرتے تھے اور ان سے جانوروں کی طرح بیگاریں لیتے
تھے۔ لیکن ان کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی
مصیبتوں میں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اور ان کی گتھیوں کا
کوئی حل ان کے پاس نہ تھا۔ ان بالادست طبقوں کی عیاشیوں
اور نفس پرستیوں نے اخلاقی روح کو ہلاک کر دیا تھا۔
بادشاہتوں کے ادل بدل، نت نئے فاتحین کے ظہور اور خونریز
جنگوں کی وجہ سے حالات میں جو تموج پیدا ہوتا تھا۔ اس میں بھی
کوئی راہ نجات عام آدمی کے لئے نہ نکلتی تھی۔ عام آدمی کو ہر
تبدیلی کی چکی اور زیادہ تیزی سے پیستی تھی۔ ہر قوت اسی کو آلۂ
کار بنا کر اسی کا خون صرف کر کے اور اسی کی محنتوں سے استفادہ
کر کے اپنا جھنڈا بلند کرتی تھی، اور پھر غلبہ و اقتدار پانے کے
بعد وہ پہلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ظالم ثابت ہوتی تھی۔ خود روم
و ایران کے درمیان مسلسل آویزش کا چکر چلتا تھا۔ اور مختلف

علاقے کبھی ایک حکومت کے قبضے میں جاتے اور کبھی دوسری

سلطنت ان کو نگل لیتی۔ لیکن ہر بار فاتح قوت عوام کے کسی نہ کسی

طبقے کو خوب اچھی طرح پامال کرتی مثلاً رومی حکومت آتی تو آتش

کدے کلیساؤں میں بدل جاتے۔ اور ایرانی راج چھا جاتا تو

پھر کلیسا آتش کدے بن جاتے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں

طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ نت نئے ٹکراؤ ہوتے۔ بار بار

کشت و خون ہوتے۔ بغاوتیں اٹھتیں۔ مذہبی فرقے خونریزیاں

کرتے اور ان ہنگاموں کے درمیان انسان بہ حیثیت انسان

بری طرح پامال ہو رہا تھا۔ وہ انتہائی مشقتیں کر کے بھی زندگی کی

ادنیٰ ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہ تھا، اسے مظالم کے کولہو میں

پیلا جاتا تھا۔ مگر تشدد کی خوفناک فضاء میں وہ صدائے احتجاج

بلند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تلخ احساسات رکھتا مگر اسے ضمیر کی

آزادی کسی ادنیٰ درجے میں بھی حاصل نہ تھی۔ اس کی مایوسیوں

اور نامرادیوں کا آج ہم مشکل ہی سے تصور کر سکتے ہیں کہ وہ

ماحول کے ایک ایسے آہنی قفس میں بند تھا جس میں کوئی روزن کسی طرف نہیں کھلتا تھا۔ اس کے سامنے کسی امید افزا اعتقاد اور کسی فلسفے یا نظریے کا جگنو تک نہیں چمکتا تھا، اس کی روح چیختی تھی، مگر پکار کا کوئی جواب کسی طرف سے نہ ملتا تھا۔ کوئی مذہب اس کی دستگیری کے لئے موجود نہ تھا کیونکہ انبیاء کی تعلیمات تحریف و تاویل کے غبار میں گم کی جا چکی تھیں اور باقی جو شئے مذہب کے عنوان سے پائی جاتی تھی اسے مذہبی طبقوں نے متاع کاروبار بنا لیا تھا۔ اور انہوں نے وقت کی ظالم طاقتوں کے ساتھ سودے گانٹھ لئے تھے۔ یونان کا فلسفہ سکتے میں تھا۔ کنفیوشش اور مانی کی تعلیم دم بخود تھی۔ ویدانت اور بدھ مت کے تصورات اور منوشاستر کے نکات سربگریباں تھے۔ جسٹینین کا ضابطہ اور سولن کا قانون بے بس تھا کسی طرف کوئی روشنی نہ تھی۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان حالات کے ایک آہنی قفس میں بند ہو جاتا ہے اور اسے کسی طرف سے نجات کا راستہ دکھائی نہیں

دیتا تو تمدنی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ ﴿۱﴾ عالم انسانی کے اس

تاریخی دور پر قرآن نے چند الفاظ میں ایسا مکمل تبصرہ کیا ہے کہ

بڑی سے بڑی عبارت آرائی اس کے سامنے سرنگوں ہے۔ فرمایا

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي

النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ.

(الروم)۔ وہ خوفناک ترین بحران کا ایک عالمگیر دور تھا ﴿۲﴾

اس دور کا مختصر جائزہ لینے کے لئے ملاحظہ ہو۔ انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ از مولانا سید ابو الحسن علی

ندوی (باب اول) نیز ملاحظہ ہو رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی

۔ از ڈاکٹر حمید اللہ: بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت۔ مزید

ملاحظہ ہو: سیرت النبی۔ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم (ج۔

۳ اسباب شب ظلمت)۔ جس کی اندھیاریوں میں محسنِ انسانیت

کی مشعل یکایک ابھرتی ہے اور وقت کے تمدنی بحران کی

تاریکیوں کا سینہ چیر کر ہر طرف اجالا پھیلا دیتی ہے۔

خود عرب کا قریب ترین ماحول جو حضورؐ کا اولین میدان

کار بنا، اس کا تصور کیجئے تو دل دہل جاتا ہے۔ وہاں عاد و ثمود کے

ادوار میں اور سباء اور عدن اور یمن کی سلطنتوں کے سائے میں

کبھی تہذیب کی روشنی نمودار بھی ہوئی تھی تو اب سے گل ہوئے

مدتیں گذر چکی تھیں۔ ﴿۳﴾ ملاحظہ ہو ارض القرآن۔ از علامہ

سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ابواب متعلقہ۔ بقیہ عرب پر دور

وحشت کی رات چھائی ہوئی تھی۔ ﴿۴﴾ ملاحظہ ہو سیرت

النبی۔ از علامہ سید سلیمان ندوی (ج ۴۔ باب ''ظہور اسلام

کے وقت عربوں کی مذہبی و اخلاقی حالت'')۔ تمدن کی صبح ابھی

تک جلوہ گر نہیں تھی اور انسانیت نیند سے بیدار نہ ہو پائی تھی۔ ہر

طرف ایک انتشار تھا، انسان اور انسان کے درمیان تصادم تھا۔

جنگ و جدال اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ شراب اور زنا اور

جوئے سے ترکیب پانے والی جاہلی ثقافت زوروں پر تھی۔

قریش نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبہ کی

مجاوری کا کاروبار چلا رکھا تھا۔ یہود نے کلامی اور فقہی موشگافیوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ باقی عرب فکر کے لحاظ سے ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ مکہ اور طائف کے مہاجنوں نے سود کے جال پھیلا رکھے تھے۔ غلام سازی کا منحوس ادارہ دھوم دھڑے سے چل رہا تھا۔ حاصل مدعا یہ کہ انسان خواہش پرستی کی ادنیٰ سطح پر گر کر درندوں اور چوپایوں کی شان سے جی رہا تھا۔ ﴿ القرآن: اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾ (الفرقان۔۴۴) جو زور والا تھا اس نے کمزوروں کو بھیڑ بکریوں کے گلوں کی طرح قابو میں کر رکھا تھا اور کمزور قوت والوں کے قدموں میں سجدہ پاش تھے۔

یہ تھے حالات جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین تبدیلی کا پیغام لے کر یکہ و تنہا اٹھتے ہیں۔ ایسے مایوس کن حالات میں کوئی دوسرا ہوتا، تو شاید زندگی سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دنیا میں ایسے نیک اور حساس لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنہوں

نے بدی سے نفرت کی۔ مگر وہ بدی کا مقابلہ کرنے پہ تیار نہ ہوسکے اور اپنی جان کی سلامتی کے لئے تمدن سے کنارہ کش ہوکر غاروں اور کھوہوں میں پناہ گزیں ہوئے اور جوگی اور راہب بن گئے۔ مگر حضورؐ نے انسانیت کی نیا کو طوفانی موجوں میں ہچکولے کھاتے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر نہیں کی، بلکہ بدی کے ہلاکت انگیز گرد ابوں سے لڑ کر ساری اولاد آدم کے لئے نجات کا راستہ کھولا۔ تمدن کی کشتی کی پتوار سنبھالی اور پھر اسے ساحل مراد کی طرف رواں کردیا۔

روم اور ایران کی دو بڑی ٹکراتی ہوئی تمدنی طاقتوں نے جو بحران پیدا کردیا تھا، اسے توڑنے کے لئے آپؐ ایک تیسری طاقت بن کے اٹھے اور آہستہ آہستہ یہ تیسری طاقت جب اپنے پیروں پہ کھڑی ہوگئی تو اس نے روم و ایران دونوں کو چیلنج کیا۔ دونوں کی مرعوب کن قیادتوں کے تخت الٹ دیئے اور عوام الناس کو خوفناک تمدنی قفس سے نکال کر آزاد فضاؤں میں اڑان

کا موقع دیا! ﴿ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم﴾ (الاعراف۔۱۵۷) اولادِ آدم کے سامنے معاً ایک راہ نجات کھل گئی، کاروانِ زندگی جو رہزنوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا وہ پھر فلاح وارتقاء کی راہوں پر گامزن ہوگیا!

یوں رسول پاک خلق خدا کے لئے نجات دہندہ بن کر تشریف لائے۔

وقت، مقام اور انسانی مواد:

مشیت الٰہی نے جہاں انسانیت کو صراط مستقیم پر لانے کے لئے حضورکی بہترین ہستی کا اصطفیٰ کیا۔ حضور کی حدیث ہے: بعثت من خیر قرون بنی آدم قرنا فقرنا حتی کنت من القرن الذی کنت منہ (بخاری روایت ابوہریرہ) دوسری حدیث ہے: ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد اسمعیل واصطفی قریشا من کنانۃ واصطفیٰ

من قریش بنی ھاشم و اصطفانی من بنی ھاشم (مسلم روایت واثلہ بن اسقع)ملاحظہ ہو ترمذی باب المناقب المواہب اللدنیہ از قسطلانی (ج ا-ص ۱۳)۔ اس سلسلہ کی تیسری حدیث ہے ان اللہ خلق الخلق و جعلنی فی خیر فرقھم و خیر الفریقین ثم تخیر القبائل فجعلنی فی خیر القبیلۃ، ثم تخیر البیوت فجعلنی فی خیر بیوتھم فانا خیرھم نفسا و خیرھم بیتاً (ترمذی روایت عباس)ان کی تائید میں مزید روایات بھی ہیں۔ وہاں وقت کے بدترین حالات کے باوجود حضورؐ کے لئے بہترین زمانہ، بہترین مقام دعوت ﴿۳﴾ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو: زاد المعاد از: علامہ ابن القیم ج ا تفسیر آیۃ وربک یخلق ما یشاء ویختار ص ۵۵ تا ۱۵ نیز ملاحظہ ہو: حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہ (ج ا- بحث ۶ - باب ۳ ۵۲،۵۳) و (ج ۲ باب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم) فصل : حضور کی عادات و خصائل کے بیان

میں۔ اور بہ حیثیت اولین مخاطب کے بہترین قوم کا انتخاب بھی کیا۔ (۱۲) ملاحظہ ہو سیرت النبی: از سید سلیمان ندوی مرحوم (ج ۴، باب۔ عربوں کی خصوصیات) علاوہ ازیں ملاحظہ ہوں احادیث تخیر واصطفٰی مندرجہ جامع ترمذی۔ باب المناقب۔

مجموعی لحاظ سے زمانہ یوں موزوں ترین تھا کہ قبائلی دور ختم ہو کر جلد ہی بین الاقوامی دور شروع ہونے والا تھا۔ اور تاریخ کچھ ہی گردشوں کے بعد سائنس کے عہد میں داخل ہونے والی تھی۔ حضورؐ کو زمانہ بعثت گویا دو دوروں کے درمیان خط فاصل تھا۔ آنے والے وسیع تر اور روشن تر دور کا افتتاح کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ انبیاء کی دعوت حق کو ایک بار پوری طرح اجاگر کر دیا جائے۔ دین کی روح کو ابھار دیا جائے۔ خدا پرستانہ تہذیب کی بنیادیں مضبوطی سے جما دی جائیں اور عدل و مساوات کا نظام رحمت کامل شکل میں پیش کر دیا جائے۔ تاکہ حضورؐ کے اس کارنامہ کی روشنی سے بعد کے ادوار منور کئے

جا سکیں۔ اور پھر یہ زمانہ اس لحاظ سے بھی موزوں ترین تھا کہ عام لوگوں کے سامنے کوئی دوسری امید گاہ باقی نہ تھی، اور ان کے دل میں قبول اسلام کے دروازے آسانی سے کھل سکتے تھے۔

مقام دعوت کے لحاظ سے دیکھیں تو عرب باوجود بے آب و گیاہ خطہ ہونے کے اس وقت کی متمدن دنیا میں وسطی حیثیت رکھتا تھا۔ ﴿۱﴾ عربوں کی مرکزی حیثیت پر ملاحظہ ہو ڈاکٹر حمید اللہ کا نوٹ مندرجہ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔ باب عرب اور مکہ معظمہ کا انتخاب دعوت اسلام کے مرکز کے طور پر۔ مشرق و مغرب اور شمال سے آنے والے تمام کاروانی راستے عرب کی سرزمین میں آکر ملتے تھے اور مختلف ممالک کے درمیان جتنی تجارت خارجہ ہوتی تھی اس کا واسطہ عرب ہی کے تجار تھے۔ عمان اور یمن، صنعا اور مکہ، جدہ اور ینبوع، مدینہ اور دومۃ الجندل کے درمیان کاروانوں کی آمد و رفت رہتی، جو عربی رہنماؤں، قریش کے پروانہ ہائے رہداری اور اہم قبائل کے

بدوؤں کے بغیر سلامتی سے گزر نہ سکتے تھے۔ اس طرح عرب کی سرزمین ...... خصوصاً مکہ، طائف، مدینہ، ینبوع اور دومۃ الجندل ...... کا رابطہ ہند، چین، ایران، عراق، مصر، روم اور حبش کے تمام علاقوں سے تھا۔ یہاں کسی بین الانسانی دعوت کا مرکز دوسرے ہر علاقے سے زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر سرزمین عرب میں مکہ اور مدینہ کے مقامات پر اہمیت رکھتے تھے کہ مذہبی اور تجارتی اور تمدنی حیثیت سے ان کی قیادت کا سکہ چلتا تھا۔

عرب کا غیر متمدن اور بتلائے انتشار رہنا اور اقتصادی حیثیت سے کمزور رہنا اگرچہ کئی مشکلات کا باعث تھا مگر اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ بیرونی تسلط سے بھی بڑی حد تک آزاد تھا۔ اور داخلی طور پر بھی کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو باقاعدہ سیاسی اقتدار پورے ملک پر جما چکی ہوتی اور پھر اقتدار، قانون اور تعلیم سے کام لے کر انسانوں کو ایک خاص نقشے پر ڈھال چکی ہوتی۔ ایسی طاقت اگر کوئی موجود ہوتی تو وہ اسی طرح دعوت حق

کو کچل دے سکتے تھی جیسے پہلے بعض ظالم بادشاہوں نے انبیاء کی دعوتوں کی تکمیل تک پہنچنے سے قبل روک دیا۔ بلاشبہ قریش کا بڑا گہرا اثر موجود تھا۔ اور یہ پورے زور سے رکاوٹ بنا۔ لیکن قریش کو پورے عرب پر باقاعدہ سیاسی تسلط حاصل نہ تھا۔ ان کا مذہبی و تجارتی اثر کتنا بھی گہرا رہا ہو، منظم حکومت کا بدل نہیں ہو سکتا۔

دینی لحاظ سے دیکھیں تو اس سرزمین کے چاروں طرف انبیاء ماسبق کی دعوتوں کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔ اور ان کی قوام کے آثار آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ (القرآن آیت: افلم یھدلھم کم اھلکنا قبلھم من القرون یمشون فی مسا کنھم۔ (طٰہٰ ۱۲۸، والسجدہ ۲۶) شمال میں ظہور ابراہیمی کا مقام ارتقاء اس کے قریب کچھ اوراوپر نوح علیہ السلام کا علاقہ تھا۔ پھر لوط علیہ السلام کا مقام دعوت تھا، پھر مدائن صالح تھا۔ پھر فلسطین و یروشلم کا علاقہ تھا۔ جہاں بنی اسرائیل

نے عروج وزوال کے دور گزارے اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام

نے سچائی اور نیکی کا پیغام سنایا۔ جنوب میں عاد وثمود کی بستیاں

تھیں۔ سد مارب تھا جس کے ٹوٹنے سے سیل عرم کا عذاب پڑا۔

سبا کی سلطنت تھی۔ سمندر پار مصر کی سرزمین تھی جہاں یوسف

علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام نے انسانیت کی روشنی دی تھی......

اور پھر مکہ تھا جہاں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے مرکز توحید

کی مستحکم کیا اور عبودیت وطاعت کی روشن یادگاریں چھوڑیں۔

خدا پرستی اور توحید اور اصلاح انسانیت کے فروغ کے لئے آخر

اس سے بہتر علاقہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ یہاں دعوت حق کی

آواز اٹھانے سے انسانی ذہن میں سابق انبیاء کے چھوڑے

ہوئے دھندلے نقوش بآسانی تازہ ہو سکتے تھے۔ ﴿۲﴾ ملاحظہ

ہو: ارض القرآن از سید سلیمان ندوی مرحوم۔

انسانی مواد (Human Material) بھی بہترین

وہ تھا جو عرب کی سرزمین میں موجود تھا۔ اس کی سب سے بڑی

خوبی یہ تھی کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے خزانے غیر استعمال شدہ اور محفوظ پڑے تھے۔ یہ لوگ ابھی ان مہلک روگوں سے محفوظ تھے۔ جو روم و ایران کے بیمار تمدنوں نے پیدا کر دیئے تھے۔ ان میں وحشیانہ طرزِ زندگی کی خرابیاں موجود تھیں مگر دوسری طرف خوبیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یہ لوگ بدویت کی وجہ سے مزاج میں فطری سادگی رکھتے تھے اور تکلفات اور تصنعات سے پاک تھے۔ آثارِ فطرت کا قریبی مشاہدہ رکھنے کی وجہ سے کائنات میں آیاتِ حقیقت کو پڑھ سکتے تھے۔ گرم آب و ہوا، لو کے تھپیڑوں، دن رات کے سفروں، بھوک اور پیاس کے تجربوں، اور آئے دن کے قتل و غارت کی وجہ سے ان میں سخت جانی موجود تھی اور وہ جذبہ شجاعت کو پروان چڑھانے میں مد تھی۔ ایک عالمی تحریک کو لے کر اٹھنے کے لئے شجاعت مند عنصر ہی مفید ہو سکتا تھا۔ ان میں فیاضی موجود تھی اور ایک بڑا کام کرنے کے لئے کوئی بخیل قوم موزوں نہ ہوتی۔ اس قوم کا حافظہ بلا کا تھا

اور یہ اپنے انساب کے علاوہ اپنے گھوڑوں تک کے سلسلہ ہائے نسب محفوظ رکھتے تھے۔ ایسے لوگ ایک نظام زندگی کی تعلیم کو اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لئے بہترین کارکن بن سکتے تھے۔ ان میں غیرت و حمیت کا جذبہ بھی پوری طرح برسر کار تھا اس لئے یہ جوہر خودی کا تحفظ کر سکتے تھے اور دوسروں کی ذہنی غلامی اور مرعوبیت سے بلند تر رہ سکتے تھے۔ ان کی زبان ایک اعلیٰ اور وسیع اور ترقی پذیر زبان تھی جس میں فصاحت و بلاغت کا جوہر خوب نکھر چکا تھا۔ لہذا اس حیثیت سے وہ بآسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ نیز دوسروں کو کسی انقلابی پیغام سے متاثر کرنے میں زیادہ اچھی طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

عرب عزم اور دھن کے پکے تھے۔ وہ اگر کسی غلط روش پر چلتے تو پورے شرح صدر سے چلتے اور مزاحمتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے لیکن ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ اگر انہیں راہ راست پر ڈال دیا جائے تو پھر ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائیں۔

ایسے مختلف وجوہ ہیں، جو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حضورؐ

جہاں اپنی ذات میں اپنے مشن کے لئے بہترین داعی و قائد

تھے، وہاں آپ کو بہترین انسانی مواد بھی فراہم کیا گیا۔ (۱)

ملاحظہ ہو: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ باب۔

عرب اور مکے کا انتخاب فصل عمرانی وجہ۔ نیز ملاحظہ ہو: سیرت

النبی ج ۲ باب۔ عربوں کی خصوصیات۔

پھر یہ انسانی مواد ہر لحاظ سے ارتقاء کا قدم آگے

بڑھانے کے لئے بے چین تھا۔ مذہبی لحاظ سے ذہین عناصر میں

سخت اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور خاص لوگ حقیقت کی روشنی اور

الہامی رہنمائی کے پیاسے تھے۔ سیاسی لحاظ سے مکہ اور مدینہ

جیسے شہروں میں سیاسی ہیئت کی تشکیل کا آغاز ہو رہا تھا اور کسی

قدر جمہوری رنگ کے ساتھ ایک شہری ریاست کا بے ترتیب سا

ڈھانچہ بن رہا تھا۔ پھر عرب کے معاشی ذرائع کی محدودیت زور

کر رہی تھی کہ آبادی اپنے ریگ زار سے باہر پھیلاؤ اختیار

کرے۔ یوں بھی مشیت کا ایک تاریخی کلیہ یہ ہے کہ جب رائج الوقت تمدنوں میں بحران آجاتا ہے اور ان کی قیادتیں فاسد ہو جاتی ہیں تو کسی نئی قوت کو بدویت کے گہوارے سے اٹھا کر میدان میں لایا جاتا ہے۔ جیسے خدا کی مشیت نے فرعونی اقتدار کے مقابل میں بنی اسرائیل کو اٹھا کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان سارے پہلوؤں سے اہل عرب کرۂ ارضی کا وہ بہترین مواد تھے جس کے ذریعہ زندگی کا اساسی اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا۔

انقلابی کلمۂ حق:

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعتقادی، کسی نظریاتی اور کسی نقشۂ فکر کے بغیر اصلاح و تعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہ تھا، کوئی جنون خام نہ تھا، بلکہ حضورؐ

کون ومکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کے اٹھے۔ انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضورؐ نے زندگی کے معمے پہ کاوشیں کی تھیں۔ غار حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی عالم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح و فساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا...... لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الٰہی نے آپؐ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپؐ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور انسان اس کا بندہ ہے! یہی کلمہ حق حضورؐ کے انقلاب کا بیج تھا۔ اسی بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرۂ طیبہ نمودار ہو سکتا تھا جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں اور اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضورؐ کا کلمہ صد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا۔ لا الٰہ الا اللہ!

Source: www.prophetmuhammadforall.org 63 :صفحہ نمبر

لفظی پہلو سے انتہائی مختصر، معنوی لحاظ سے بے حد عمیق۔ "ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ صرف وہی ایک الٰہ ہے"۔ الٰہ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے، جس پر آدمی والہانہ طور پر فدا ہو جس کی عظمت مان کر پرستش کرے، جس کی تحمید و تقدیس کرے۔ جس کے گن گائے۔ جس کی تسبیح کرے۔ جس کو نذر پیش کرے، جس سے بھلائی کی امید لگائے اور جس کی گرفت سے ڈرے، جس سے نیکی کی جزا کا امیدوار ہو اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رکھے۔ جس کو اپنا مالک و مختار سمجھے، جس کو فرماں روا اور قانون ساز مانے، جس کے مطالبوں کو پورا کرے اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے جس کے دیئے ہوئے اصولوں کو بنائے زندگی۔ جس کو اپنے لئے سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرے جس کی مرضی کے مطابق حیات کی تشکیل کرے۔ جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے۔ جس کے اشاروں میں تن من دھن

کی بازی لگائے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا۔

الوہیت کے یہ حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے۔ اور بے شمار آلہہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلوی وحدتوں کی روایات، جاگیردار اور پجاری طبقوں کی بالادستی شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی، یہ مختلف طبق بر طبق الوہیتیں تھیں جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا "لا الٰہ الا اللہ" کی شاہ ضرب ان سب پر یکدم پڑتی تھی۔ اس کلمے کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا، کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور

کسی کے اشارہ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا، خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ گویا انسان کی سچی آزادی کا اعلان تھا

لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لئے واحد ذریعہ وہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے، زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے لئے رہنما اصول ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے اور اس ہستی کی قیادت میں قافلۂ انسانیت فلاح و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے ان کا اقرار

اسلام میں داخلہ کی شرط اول ٹھہرا۔ اس کلمے کو موذنوں نے بلند آواز سے پکارا۔ اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا۔ اسے افضل الذکر قرار دیا گیا۔ اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

حضورؐ کا انقلابی کلمۂ حق جس دل میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی۔ اور نشو ونما پانے لگے۔

اصلاح تمدن کے لئے حضورؐ کا نصب العین:

سیرت پاک سے صحیح استفادہ کرنے کے لئے اس اہم سوال کا جواب ضرور سامنے ہونا چاہئے کہ حضورؐ کے پیش نظر تبدیلی کا دائرہ کام کا پیمانہ کیا تھا؟ تمدنی نظام میں حضورؐ کوئی جزوی اصلاح چاہتے تھے یا ہمہ گیر؟ دعوت مذہبی و اخلاقی تھی یا وہ سیاسی اہمیت بھی رکھتی تھی؟ بالفاظ دیگر تمدنی دائرہ میں نصب

الجھن کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے موجود ہے اور مختلف پیرایوں میں تکرار سے اسلامی دعوت کا مدعا واضح کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو آیات کو لیتے ہیں۔ ایک مقام پر جملہ انبیاء ورسل کی بعثت کا مقصود یوں بیان کیا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (الحدید۔ ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کے لئے بھیجا ہے اور جس غرض کے لئے ان پر کتابیں نازل کی ہیں اور ان کو ضابطہ حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں"۔

بات نہایت ہی صاف ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظام قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور تمدن میں عملاً توازن

پیدا کرنا ہے۔ اس آیت میں مصطلا آہنی اسلحہ کو بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ یعنی نظام حق کی اقامت اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لئے سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے۔

خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت اور زیادہ صراحت سے بیان کی گئی اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار بیان کی گئی۔ ملاحظہ ہو:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلمہ! ...... ولو کرہ المشرکون۔ (الصف۔ ۹)

"وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور دین حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہر دین کے مقابلے میں اسے (پوری انسانی زندگی پر) غالب کردے! ...... اگرچہ یہ

مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو"۔!

مدعا یہ کہ قریش اور عرب کے دوسرے مشرکین تو اپنے جاہلی نظام حیات کو برقرار رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے اور جاہلیت کے خلاف جو آواز اٹھے گی وہ انہیں تحت ناگوار ہوگی۔ مگر ان کی ناگواریوں کی پروا کئے بغیر ان کے محاذ مخالفت کو توڑ کر حضورؐ کو اقامت دین کرنا ہے اور خدا کو ضابطۂ ہدایت کو عملاً جاری کرنا ہے۔ یہ مدعا اگر دعوت حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں آتے؟ جان و مال کی قربانیاں کاہے کے لئے مانگی جاتیں؟ کس مقصد کے لئے "کونوا انصار اللہ" کی صلائے عام دی جاتی؟ کس غایت کے لئے "حزب اللہ" یا اللہ کی پارٹی تشکیل پاتی؟ کس نصب العین کے لئے شہداء چنے جاتے؟ قرآن اور سیرت دونوں کا فہم دعوت حق کے ملتہا کو ذہن نشین کئے بغیر ممکن نہیں رہتا۔

آیئے اب ہم خود حضورؐ کے ابواب سیرت کا مطالعہ کرکے اس نصب العین کا سراغ لگائیں جو پیش نظر تھا!

حضورؐ نے بالکل ابتدائی مرحلے میں خاندان بنی ہاشم کی ایک ضیافت اپنا پیغام سنانے کے لئے منعقد کی تھی۔ اس میں اجمالاً بیان فرمایا تھا کہ یہ دعوت دینا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی ضامن ہوگی۔ بہت عرصہ بعد قریش کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے اسی بات کو دہرایا اور فرمایا:۔

فان تقبلوا مني ما جئتكم به فهو حظكم في الدنيا والآخرة.

"تم اگر میری وہ دعوت قبول کرلو جسے میں پیش کررہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے"۔

دنیا کی بہتری اور بھلائی کے سادہ الفاظ سے کسی جزوی بھلائی کو مراد لینا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ جزوی بھلائی تو ہر

دعوت میں موجود ہوتی ہے۔ اور ہر نظام شر میں بھی کچھ اچھے پہلو ہوتے ہیں۔ مطلب زندگی سنور جانا اور تمدن کا درست ہو جانا۔ نظام مقسط کا قائم ہو جانا اور حیات طیبہ کا حاصل ہو جانا ہے۔

پھر ابتدائی دور کشمکش میں ایک اور موقع پر حضورؐ سے گفت و شنید ہوتی ہے تو اس کے دوران میں فرماتے ہیں:۔

کلمة واحدة تعطونيها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم.

"بس وہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر مجھ سے قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم سارے عرب کو زیر نگیں کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا"۔

میلوں اور حج کے موقعوں پر قبائل کے کیمپوں میں جا جا کر حضورؐ نے یہی بات ہر سردار قبیلہ سے کہی۔ فرماتے مجھے ساتھ لے چلو، مجھے کام کرنے کا موقع دو اور مجھ سے تعاون کرو۔

یہاں تک کہ خدا کی طرف سے اس پیغام کو میں واضح کردوں جس کے لئے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔ چنانچہ بنو عامر کا سردار بحیرہ بن فراس حضورؐ کے پیغام اور حضورؐ کی شخصیت اور حضورؐ کی والہانہ سرگرمی کار سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر یہ نوجوان میرے ہاتھ آجائے تو میں سارے عرب کو نگل جاؤں۔ اس کی نگاہیں حضورؐ کی دعوت کے منتہا اور کام کے نتائج تک پہنچ گئیں۔ اور اسی لئے اس نے ایک سودا گانٹھنا چاہا۔ حضورؐ کو وہ اپنا تعاون اس قیمت پر پیش کرتا ہے کہ جب آپؐ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو جائے، تو آپؐ کے بعد اقتدار ہمیں حاصل ہو۔ ماننا پڑتا ہے کہ بحیرہ کی نگاہ بڑی دوررس تھی ...... اب اگر حضورؐ محدود مذہبی تصور کے محض واعظ اور مبلغ ہوتے اور کوئی سیاسی منتہا آپؐ کے سامنے سرے سے نہ ہوتا تو صاف کہہ دیتے کہ بھائی میں تو ایک اللہ والا ہوں۔ مجھے اقتدار کے بکھیڑے سے کیا مطلب اور میرے کام میں حکومت اور قیادت کا کیا سوال! مگر

حضورؐ کا جواب یہ تھا۔ حضورؐ نے یہ فرمایا کہ "الامر الی اللہ، یضعہ حیث یشآء" اقتدار کا معاملہ خدا کے اختیار میں ہے اور وہ جس کے قبضے میں چاہے گا رکھے گا۔ اور سودا چکانے سے انکار کر دیا۔

حضورؐ کی دعوت کے سلسلے میں "عرب و عجم کے اقتدار" کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا، جیسے کہ وہ تحریک اسلامی کا سلوگن ہو۔ بچے بچے کی زبان پر یہ بات رہتی تھی، حتّیٰ کہ مخالفین نے اسی کو بنائے طنز بنا لیا تھا، اسلام کے سائے میں جو غلام اور غریب طبقوں کے نوجوان آ آ کے جمع ہو رہے تھے، اور جن کو قریش تشدد کے کولہو میں پیل رہے تھے ان کو دیکھتے تو اشارے کر کر کے طنزاً کہتے کہ وہ کیا کہنے ہیں ان ہستیوں کے، یہ ہیں جو عرب و عجم کے حکمراں اور سردار بننے والے ہیں۔

طنز و تمسخر اور مخالفت و مزاحمت کے سارے طوفان

اٹھانے کے باوجود قریش کے سمجھدار لوگ دلوں کی گہرائیوں میں یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ دعوت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ اس سے بڑے بھاری نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ ایک مرتبہ عتبہ کو سرداران مکہ نے حضورؐ سے گفت و شنید کے لئے بھیجا۔ عتبہ نے حکومت، مال اور دولت اور دنیوی مفاد کی ہر ممکن پیشکش حضورؐ کے سامنے بیان کی۔ کہ کسی طرح آپ اس انقلابی مہم سے باز آجائیں۔ حضورؐ نے جواب میں سورۃ حمٰ کی آیات سنائیں۔ عتبہ جو تاثر اس مجلس سے لے کر گیا اس نے اس کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس نے جا کر کہا، کہ اس دعوت میں تو ایک "نبا عظیم" مضمر ہے۔ یعنی یہ ایک بہت بڑی تبدیلی کی حامل ہے۔ کوئی انقلاب آنے والا ہے اور زندگی کا نقشہ زیر و زبر ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے مشورہ دیا کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تم درمیان میں حائل نہ ہو۔ اگر اہل عرب نے اس شخص کا خاتمہ کر دیا، تو تم سستے چھوٹے اور اگر اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو ملک، ملک کم و

عـزکـم و کـنـتـم اسـعـد الـنـاس۔ اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہوگی۔ اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہوگا۔ اور تم لوگوں میں سب سے بڑھ کر معزز ہو جاؤ گے۔ یعنی عتبہ تک یہ حقیقت پا گیا کہ اس دعوت کے پردے میں ایک سلطنت چھپی ہوئی ہے اور یہ اقتدار پر منتج ہوگی۔ تو آخر خود حضورؐ اور حضورؐ کے رفقاء اس ملتجا سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔

ایک موقع پر جب تشدد کی بھٹی خوب گرم تھی۔ حضورؐ کے رفقاء نے اپنا دکھڑا بیان کیا، اور دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے پہلے تو ان کو بتایا کہ اقامت دین کی جدوجہد کی گھاٹیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں اور ماضی میں جو جوانوں نے یہ فرض ادا کیا ہے انہیں کیا کچھ پیش آیا اور پھر پورے وثوق سے مژدہ سنایا، کہ "خدا کی قسم! اس مہم کو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے مرحلہ تکمیل تک پہنچائے گا"۔ پھر اس مرحلہ تکمیل کی کیفیت بیان کی کہ:۔

"ایک سوار صنعاء سے حضرِ موت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا"۔

یعنی ایک نظام عدل اور دورِ رحمت چھا جانے والا ہے اور ایسا پر امن ماحول قائم ہونے والا ہے کہ آج جہاں ڈاکے پڑ رہے ہیں اور قتل ہو رہے ہیں، جہاں آدم زاد دن دھاڑے زمین سے اچک لئے جاتے ہیں اور جہاں کھلم کھلا عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ وہاں مسافر کل تن تنہا اس سرزمین میں بے کھٹکے سفر کرے۔ کسی کو اس کی جان اس کے مال اور اس کی عزت سے تعرض کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ ایک بار حضورؐ نے یوں بھی فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مکہ کو بے نگہبان کے قافلہ جایا کرے گا۔

نصب العین کا کتنا واضح اور اجلا تصور ہے!

ایک مرتبہ عثمان بن طلحہ کلید بردار کعبہ سے حضورؐ نے کعبہ

کا دروازہ کھلوانے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ بظاہر تخت ناسازگار رہا ہوں کن حالات کے درمیان کھڑے ہو کر اس وقت حضورؐ نے فرمایا۔ کہ ایک دن آنے والا ہے جبکہ یہ کنجی خود ہمارے ہاتھ میں ہو گی اور ہم جسے چاہیں گے تفویض کریں گے۔

عقبہ کے مقام پر انصار مدینہ سے جو تاریخی بیعتیں واقع ہوئیں ان کا مطالعہ کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انصار تک نے اس سیاسی کشمکش کی وسعتوں کو سمجھ لیا تھا جو دعوت حق کے نتیجے میں نمودار تھی اور جس کا فیصلہ آگے چل کر میدان جنگ میں ہونے والا تھا۔ ایک طرف انصار حضورؐ کی حمایت میں سرخ و سیاہ سے معرکہ آرا ہونے کا پیمان باندھ رہے ہیں اور اپنے اشراف کی ہلاکت اور مالوں کی تباہی کو لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف حضورؐ سے عہد لیتے ہیں، کہ جب خدا محمدؐ کو غلبہ عطا کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر واپس نہ چلے آئیں گے۔ جنگ قربانیاں اور

غلبہ...... کیا ان تصورات میں وہ نصب العین نمایاں اور واضح نہیں ہے جو حضورؐ کے سامنے تھا!

ہجرت کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جو دعا آپ کو سکھائی جاتی ہے اس دعا کا تکمیلی جزیہ ہے کہ واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا حضورؐ کو خدا سے سلطان نصیر کی طلب سکھائی گئی ہے...... یعنی مقدس مشن کی پشت پناہی کرنے کے لئے اقتدار اور فرمانروائی درکار تھی۔

جناب ابوطالب پر جب حضورؐ کی حمایت ترک کرنے کے لئے دباؤ ڈالا گیا تو انہوں نے حضورؐ سے گفتگو کی کہ میرے لئے مشکلات نہ پیدا کرو۔ اس پر حضورؐ نے وہ مشہور جواب دیا تھا کہ خواہ یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب کیوں نہ لا کر رکھ دیں، میں اپنے مشن سے باز نہیں رہ سکتا۔ حضورؐ نے اپنی بات ان الفاظ سے مکمل کی تھی کہ......

"...... یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے گا یا اس میں اپنی جان کھپا دوں گا"۔

یہاں لفظ لیتمہ، نہیں لیظھرہ استعمال فرمایا جس میں کشمکش کا تصور شامل ہے اور آگے کا جملہ بتاتا ہے کہ کشمکش بھی ایسی ہے جس میں جان جوکھوں میں ڈالنے کا معاملہ ہے۔

مدنی دور میں عدی بن حاتم حاضر ہو کر حضورؐ کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے۔ دعوت کی نوعیت سمجھنا چاہتا ہے۔ ناقدانہ نگاہ سے حضورؐ اس سے گفتگو کرتے ہوئے جہاں یہ بتاتے ہیں کہ عنقریب بابل کے سفید محلات اسلام کے تسلط میں ہوں گے، عنقریب یہاں دولت کی ریل پیل ہوگی اور عنقریب مسلمانوں کی عددی قوت بہت ہی بڑی ہوگی وہاں سے اسلامی نظامِ عدل کی اس شان سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ عنقریب تم دیکھو گے کہ ایک عورت قادسیہ سے اونٹ پر تن تنہا اس مسجد تک آنے کے

لئے نکلی اور خیر و عافیت سے پہنچی۔

بظاہر بے سر و سامانی کے عالم میں سفر ہجرت کرتے ہوئے جو نگاہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ لیتی ہے، کیسے یہ کہتے ہو کہ اسے اپنی دعوت کے منتہا اور اپنے تمدنی نصب العین کا پتہ نہ تھا! کیسے یہ سوچتے ہو کہ اسلامی ریاست بطور مقصد کے پیش نظر نہ تھی۔ اس کے لئے تیاریاں نہیں کی گئیں، اس کے لئے جدوجہد عمل میں نہیں آئی اور وہ اچانک بطور انعام حضور کی جماعت کو تفویض کر دی گئی۔ کہہ سکتے ہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ حکومت محض برائے حکومت مطلوب نہ تھی۔ کہہ سکتے ہو کہ حکومت ذاتی اقتدار اور دنیوی فوائد کے حصول کے لئے مطلوب نہ تھی۔ مگر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اقامت دین کے لئے، عدل کے قیام کے لئے، انسانیت کی نجات کے لئے، معاشرہ کی تعمیر کے لئے بھی حکومت مطلوب نہ تھی!

درحقیقت حضورؐ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا، وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی، وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضورؐ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی رابطوں سمیت کرنا چاہی۔ حضورؐ نے انسان کو تمدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اس کی نجی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ یہ حقیقت سامنے رکھیئے اور حضورؐ کے نصب العین کی پوری وسعت کو ذہن نشین کر لیجئے تو پھر واقعات سیرت میں پورا تسلسل دکھائی دے گا اور ہر واقعہ اور اقدام اور تدبیر کی توجیہہ ہوتی جائے گی۔ بصورت دیگر نہ سیرت پاک کے اسرار کھلتے ہیں اور نہ قرآن مقدس کے نکات واضح ہوتے ہیں۔

ایک دین...... ایک تحریک!!

فلسفہ کا دائرہ ہمیشہ فکر کا دائرہ رہا ہے۔ فلسفی کو عملی زندگی اور تاریخ کے مدوجزر سے براہ راست واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ واقعات واحوال سے نتائج تو نکالتا ہے لیکن واقعات و احوال کا رخ بدلنے کے لئے کسی عملی جدوجہد میں حصہ نہیں لیتا۔ مذہب (مروجہ محدود معنوں میں) ذرا سا آگے بڑھتا ہے۔ وہ کچھ اعتقادات دینے کے ساتھ ساتھ فرد کو تمدن سے الگ کر کے اسے ایک اخلاقی تعلیم بھی دیتا ہے لیکن مذہب کا راستہ نظام اجتماعی سے باہر باہر ہو کے گزرتا ہے۔ اور وہ نہ سیاسی ہیئت سے کوئی تعرض کرتا ہے، نہ معاشرے کے ادارات میں کوئی جامع تبدیلی چاہتا ہے۔ اور نہ وقت کی قیادت کو چیلنج کرتا ہے۔ مذہب کی دعوت ہمیشہ وعظ کے اسلوب پر ہوتی ہے۔ واعظ نے نرم و شیریں انداز سے کچھ نصیحتیں کیں، اور اپنا راستہ لیا۔ اسے نہ اس کی فکر کہ اس کے مخاطب حالات کے کس قفس میں گرفتار ہیں۔

نہ اس کی پروا کہ کون سے طبقات اور عناصر کن اقدامات اور سرگرمیوں سے لوگوں کے ذہن و کردار کو کس رخ پہ لے جا رہے ہیں، نہ اس طرح توجہ کہ روزمرہ حالات و واقعات کی رو کیا اثر چھوڑ رہی ہے۔ نہ یہی کاوش کہ میرے وعظ کے حق میں اس اور اس کے خلاف کیا کیا افکار و نظریات کس کس جانب سے کتنا اثر ڈال رہے ہیں نہ یہ پیش نظر کہ میرے مذہبی سانچے میں ڈھلنے والے متقی ترین افراد کیسے نظام تمدن کے پرزے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی اجتماعی نصب العین نہیں ہوتا۔ تبدیلی کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ کسی سیاسی شعور اور قائدانہ بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زندگی کے ایک چھوٹے سے خانے میں جزوی نیکی پیدا کرنے کے لئے جو کچھ بن آیا کر دیا۔ اور بقیہ وسیع دائرہ میں بدی اپنا جھنڈا اطمینان سے لہراتی رہے۔ کسی اللہ والے کو اس سے کیا مطلب!

حضورؐ نہ تو ایک فلسفی تھے کہ محض چند اونچے اور گہرے

خیالات دے دیتے اور واقعاتی احوال سے تعرض نہ کرتے، اور نہ ایک واعظ تھے جو اجتماعی فساد سے آنکھیں بند کرکے محض فرد کو مخاطب بناتے اور ٹھنڈے اور میٹھے وعظ سنایا کرتے اور نتائج پر سرے سے سوچا ہی نہ کرتے۔ انسانیت کے اس محسنؐ نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیات انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ ان قوتوں اور عناصر کو پہچانا جو نظام حیات پر حاوی تھیں۔ اس قیادت کو زیر نظر رکھا جو جاہلی تمدن کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے دلائل کے ساتھ دعوت بھی دی۔ اس پر تنقید بھی کی اور اسے چیلنج بھی کیا۔ تاریخ کے دھارے پر نگاہ رکھی۔ حالات و واقعات کی ایک ایک لہر پر توجہ دی۔ ہر واقعے کو قائدانہ بصیرت اور سیاسی شعور کے ساتھ دیکھا کہ وہ کس پہلو سے اصلاح کی مہم کے لئے مفید پڑتا ہے اور کس پہلو سے خلاف جاتا ہے۔ معاشرے کے جملہ عناصر پر توجہ رکھی کہ دعوت کے لئے کس موقع پر کس سے کیا امیدیں کی جاسکتی ہیں۔ اپنی قوت اور رفتار کو

حریفوں کی قوت و رفتار کے مقابل میں ملحوظ رکھا۔ ہر اقدام کے لئے صحیح ترین وقت کا انتظار صبر سے کیا اور جب موزوں گھڑی آگئی تو جرأت سے قدم اٹھایا۔ رائے عام کے ہر مدوجزر کا کامل فہم حاصل کیا اور مخالفین کے ہر پروپیگنڈے کا مقابلہ کر کے ان کے اثرات کو توڑا۔ شعر اور خطابت کے مخالفانہ محاذ قائم ہوئے۔ تو ان کے جواب میں اپنے شعراء اور خطیبوں کو کھڑا کیا۔ اپنے اصولوں کی کڑی پابندی کی مگر آنکھیں بند کر کے نہیں، بلکہ احوال و ظروف کو دیکھا۔ وقت کی مصلحتوں کو سمجھا اور حکیمانہ نقطۂ نگاہ اختیار کیا۔ جہاں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا، آگے بڑھایا۔ آگے بڑھنا جب موزوں نہ دیکھا تو قدم روک لیا۔ دو بلائیں سامنے آگئیں تو ایک سے بچ کر دوسری کا مقابلہ کیا۔ جنگی کارروائی کی ضرورت پڑی تو دریغ نہیں کیا۔ مصالحت کی راہ ملی تو دست صلح بڑھا دیا۔ اور پھر کمال یہ کہ اس ساری جدوجہد میں خدا پرستی کی روح اور اخلاقی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ ان کو

مسلسل نشوونما دی۔ اس پورے نقشہ کار اور اس پورے طریق کار کو اگر قرآن اور سیرت پاک کے اوراق سے اخذ کر کے سامنے رکھیئے تو وہ فرق بین طور پر معلوم ہو جائے گا جو مذہب اور دین میں، وعظ اور انقلابی دعوت میں، انفرادی تزکیہ اور تمدنی تحریک میں ہوتا ہے۔

حضورؐ نے چونکہ ایک مکمل دین کو برپا کرنے کے لئے تحریک برپا کی تھی۔ اس لئے آپؐ نے ایک ایک کر کے سلیم الفطرت افراد کو تلاش کیا۔ پھر جس کے سینے میں بھی کلمۂ حق کی شمع روشن ہو گئی اسے ایک تنظیم میں پرو دیا۔ اس کی تربیت کی۔ اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا اور پھر جس مرحلے میں جتنی منظم قوت حاصل تھی، اسے اپنی قیادت کے تحت جاہلی نظام کے خلاف معرکہ آرا کیا۔ فکری میدان میں بھی، سیاسی میدان میں بھی......اور بالآخر جنگ کے میدان میں بھی!!

جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہوئے ان کو آپؐ نے صوفی اور درویش نہیں بنادیا، راہبوں اور جوگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا، بدی سے بھاگنے اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت واقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت انہیں نہیں دی۔ وہ لوگ بھولے بھالے اور معذورانہ شان کے زہاد نہیں تھے۔ وہ جری اور بے باک، باشعور اور بصیرت مند، خوددار اور غیور، ذہین اور زیرک، فعال اور متحرک، پیش رو اور تیز گام تھے۔ وہ پودریوں اور سادھوؤں کے سے انداز نہیں رکھتے تھے بلکہ کارفرمائی کرنے والی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔

بہترین فطرت کے لوگ بہترین تربیت پاکر، بہترین تنظیمی رشتے سے بندھ کر اور بہترین قیادت کے ہاتھوں میں جاکر ایک ناقابل شکست قوت بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک چھوٹی سی اقلیت میں ہونے کے باوجود سارے عرب کی عظیم ترین اکثریت کو اپنے سایہ میں لے لیا۔ جب مکہ

میں جماعت اسلامی کی تعداد چالیس تھی تو مکہ اور اردگرد کی
آبادیوں میں اس تعداد نے ایک ہمہ وقتی مدوجزر پیدا کر دیا اور
پھر برسوں تک گھر گھر اور کوچہ بکوچہ اگر کوئی موضوع گفتگو تھا تو
وہ حضورؐ کی دعوت اسلامی تھی۔ مدینہ میں جا کر ابھی تحریک اسلامی
کے علمبرداروں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی کہ غیر مسلم
اکثریت کے علی الرغم اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کی جماعت کا طرز یہ نہیں تھا
کہ پہلے سارا عربی معاشرہ اسلام قبول کر لے یا اس کی اکثریت
کی اصلاح ہو جائے تو پھر جا کر نظام اجتماعی کی تاسیس کی
جائے۔ نہ نقطۂ نظر یہ تھا کہ بس دعوت دیتے رہو، خیالات و
اعتقادات کی اصلاح کرتے رہو، بالآخر ایک صالح نظام خود
بخود برپا ہو جائے گا۔ یا بطور انعام اللہ تعالیٰ حق کو غلبہ دے دیں
گے۔ وہاں تاریخ کی یہ حقیقت سامنے تھی کہ عوام کی بھاری
اکثریت حالت جمود میں پڑی رہتی ہے اور معاشرے کا ایک

قلیل عنصر فعال ہوتا ہے جس میں ایک حصہ اصلاح یا انقلاب کی دعوت کا علمبردار بنتا ہے اور ایک حصہ مزاحمت کرتا ہے۔ اصل بازی اسی فعال عنصر کی دونوں صفوں کے درمیان ہوتی ہے اور اس کا جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر عوام خود بخود حرکت میں آتے ہیں۔ یہاں یہ شعور پوری طرح کارفرما تھا کہ عوام کے راستے میں جب تک ایک فاسد قیادت حائل رہتی ہے اور ان کی زندگیوں کو بگاڑنے کی مہم جاری رکھتی ہے یا کم از کم ان کو جمود میں ڈالے رکھتی ہے وہ نہ کسی دعوت کو بڑے پیمانے پر قبول کر سکتے ہیں، نہ اپنی عملی زندگیوں میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ خود دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فاسد قیادت کے بنائے ہوئے گندے ماحول میں اپنی زندگی کو حد کمال تک سنوار سکیں۔ بلکہ الٹا اگر تبدیلی برپا ہونے میں بہت زیادہ تاخیر ہو تو بسا اوقات اس مقام کو برقرار رکھنا بھی کٹھن ہو جاتا ہے جس پر داعیان حق لمبی محنت سے پہنچتے ہیں۔ کیونکہ

مخالف حالات پیچھے دھکیلنے کے لئے پورا زور صرف کررہے
ہوتے ہیں۔ پس کسی اجتماعی تحریک کے لئے راہ عمل یہی ہوتی
ہے کہ وہ معاشرے کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کو
چھانٹ کر جتنی زیادہ سے زیادہ قوت جمع کرسکتی ہو اسے کشمکش
میں ڈال کر مقابل کی قیادت کا محاذ توڑ دے۔ تاریخ گواہ ہے
کہ تمام انقلابات فعال اقلیتوں کے ہاتھوں واقع ہوئے ہیں۔
معاشرے کے فعل عنصر میں سے تعمیر و اصلاح کی دعوت چونکہ
نسبتاً زیادہ سلیم الفطرت افراد کو کھینچتی ہے۔ اس لئے مقابل میں
رہ جانے والا طبقہ اثر و اقتدار، مال و جاہ اور کسی قدر عددی کثرت
رکھنے کے باوجود مقابلہ میں زک اٹھاتا ہے۔ معرکہ بدر اس کا
ایک نمایاں ثبوت ہے پس جب حضورؐ کے گرد عربی معاشرہ کے
فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کی اتنی تعداد جمع ہوگئی کہ وہ
اخلاقی قوت سے سرشار ہو کر جاہلی قیادت اور اس کے حامیوں کا
مقابلہ کرسکے تو حضورؐ نے اپنے سیاسی نصب العین کی طرف کوئی

ضروری قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

فتح مکہ کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اس موقع پہ جاہلی قیادت کا پوری طرح خاتمہ ہوگیا اور اس رکاوٹ کے ہٹتے عوام صدیوں پرانے جوئے سے آزاد ہوکر دعوت حق کو لبیک کہنے کے لئے ازخود آگے بڑھنے لگے۔

تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظام فلاح پنپ سکا ہو اور بغیر سیاسی کشمکش کے محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہوگیا ہو۔ ورنہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں خلافت راشدہ کے بعد وعظ ارشاد، تبلیغ و تذکیر، تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے ادارات کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں اور آج بھی علماء و صوفیاء، اصحاب درس اور ارباب تصانیف زبان و قلم سے جتنا

کام کر رہے ہیں اس کی وسعت حیران کن ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ اس حد مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہو سکا ہے اور نہ کبھی معاشرہ کی اتنی اصلاح ہو سکی ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی نظام بدل جائے۔ اور محمدؐ رسول اللہ کا انقلاب دوبارہ رونما ہو سکے۔

صاف ظاہر ہے کہ طرزِ فکر اور نقشہ کار اور نظریۂ انقلاب میں کوئی بڑا جھول ہے وہ بڑا جھول یہی ہے کہ قیادت کی تبدیلی کے لئے سیاسی کشمکش کے بغیر افراد کو نظامِ تمدن سے منقطع کر کے دعوت کا مخاطب بنایا جاتا رہا ہے۔

لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا برپا ہو جانا تو اصل مطلوب نہ تھا۔ اور یہ محض انعام خداوندی کے طور پر یکایک بیچ میں آ نمودار ہوا تو وہ حضورؐ کے کارنامے اور آپؐ کی جدوجہد کی سخت ناقدری کرتے ہیں اور حضورؐ کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی عظمت پر غبار ڈال دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ اس ہستیؐ نے کتنی تگ و دو کر کے مدینہ کے

مختلف عناصر کو چند ماہ کے اندر اندر دستوری معاہدہ کے تحت جمع

کیا، کس عرق ریزی کا سے اردگرد کے قبائل سے حلیفانہ تعلقات

قائم کیے، کس مہارت سے مٹھی بھر مسلمانوں کے بل پر ایک

مضبوط فوجی نظام اور طلایہ گردی کا سلسلہ قائم کیا، کس کاوش سے

قریش کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کرلی، کس عزیمت کے

ساتھ قریش کے تجربہ کاروں کا مقابلہ کیا، کس زیرکی سے یہود اور

منافقین کی سازشوں کی کاٹ کی، کس مہارت سے حدیبیہ کا

معاہدہ باندھا، کس ہمت سے یہود کے مراکز فتنہ کی بیخ کنی کی،

کس بیدار مغزی کے ساتھ بے شمار شر پسند قبائل کی علاقائی

شورشوں کی سرکوبی کی۔ اس سارے کام میں قائدانہ بصیرت،

سیاسی مہارت اور مضبوط حکمت عملی کے جو حیرت ناک شواہد چھپے

ہوئے ہیں ان سے لوگ کس طرح صرف نظر کرلیتے ہیں۔ یہ کہنا

کہ یہ سب کچھ خدا کا انعام تھا بالکل ٹھیک ہے لیکن اس معنی میں

ہر بھلائی خدا کا عطیہ و انعام ہوتی ہے۔ تاہم انسانوں کو کوئی

انعام ملتا بھی ہے کہ وہ اس کے لئے ضروری محنت، عقل و بصیرت کے ساتھ کر دکھائیں۔ اقامت دین کو خدا کا انعام کہہ کر اگر کوئی شخص رسولِ خدا کی جدوجہد، جانفشانی، حکمت و بصیرت اور سیاسی شعور کی نفی کرنا چاہتا ہے تو وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

بد قسمتی سے حضورؐ کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل ہو گیا ہے کہ آج حضورؐ کی دعوت اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس پہلو کو جب تک پوری سیرت میں سامنے نہ رکھا جائے وہ فرق سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، جو محدود مذہبیت اور دین کے وسیع تصور میں ہے۔ حضورؐ پورا دین لائے تھے۔ حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے۔ خدا کے قوانین کو عملاً جاری کرنے آئے تھے..... اس لئے ہمیں یہ شعور ہونا چاہئے کہ حضورؐ جامع اور وسیع معنوں میں تمدنی اصلاح اور انسانیت کی تعمیرِ نو کی تحریک چلانے آئے تھے اور اس تحریک کو چلانے کے لئے بہترین قائدانہ بصیرت اور اعلیٰ درجے کے

سیاسی شعور سے آپ کی ہستی مالا مال تھی۔ جس طرح کسی اور پہلو میں حضور کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی کوئی آپ کا ہمسر نہیں ہے۔ جس طرح آپ زندگی کے ہر معاملہ میں اسوہ و نمونہ ہیں اسی طرح سیاسی جدوجہد کے لئے بھی آپ ہی کی ذات ہمیشہ کے لئے اسوہ و نمونہ ہے۔

حضور کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے نیکی کی دعوت دی۔ نیکی کے غلبہ کے لئے جدوجہد کی اور نیکی کا ایک مکمل نظام قائم کر دیا۔ یہ کام مذہب کے محدود تصور کے دائرے میں سما نہیں سکتا۔ یہ دین تھا، یہ تحریک تھی!!

زندگی کی ہم آہنگی:

محسن انسانیت کی مقدس تحریک نے انقلاب لا کر جو نظام زندگی قائم کیا اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ اسلامی کلمہ کی روح زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں سرایت کئے ہوئے تھی۔

پورے تمدن میں ہم آہنگی تھی۔ سارے ادارے یک رنگ تھے۔ جس خدا کی عبادت مسجد کی چاردیواری میں ہوتی تھی اسی کی اطاعت کھیت اور بازار میں بھی ہوتی تھی، جو قرآن نماز میں پڑھا جاتا تھا اسی قرآن کے قانون کے ذریعہ عدالت میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے جو اخلاقی اصول گھروں کی محدود فضاؤں میں کارفرما تھے۔ وہی بین الاقوامی دائرۂ ربط میں بھی چھائے ہوئے تھے۔ جن صداقتوں کی تعلیم منبر سے دی جاتی تھی۔ انہی صداقتوں پر حکومت کا نظام ونسق چلتا تھا جو اعتقادات افراد کے ذہن نشین کرائے جاتے تھے وہی اعتقادات اجتماعی ہیئتوں پر بھی غالب تھے۔ جو طرز فکر نظام تعلیم میں کام کرتا تھا اسی کے مطابق پوری ثقافت تشکیل پارہی تھی۔ جو رضائے الٰہی نماز روزہ میں مطلوب تھی، وہی میدان جنگ میں تیر کھاتے اور تلوار چلاتے ہوئے بھی مطلوب تھی۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں پوری انسانی زندگی ایک

ہی خدائی ضابطۂ ہدایت کے تحت تھی۔ اور مختلف دائروں میں مختلف اقتدار اور ضابطے نہیں چلتے تھے۔ اس نظام میں تضاد نہ تھے۔ اس کے اجزاء آپس میں ٹکرانے والے نہ تھے۔ اس کے مختلف عناصر میں الجھاؤ نہ تھا۔ اس میں کوئی پیوندکاری نہیں کی گئی تھی۔ اسے معجون مرکب نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تحت انسان نے جس رفتار سے ترقی کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

انقلاب کی روح :

انسانیت کی شاید سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ جس کسی کو بھی برسرقوت آنے کا موقع تاریخ میں ملا ہے...... تلوار کے زور سے، سازش کے بل پر، جمہوری انتخاب کے راستے سے، یا کسی اتفاقی حادثے کے تحت...... اسی کو اپنے متعلق یہ زعم ہوگیا ہے کہ وہ نوع انسانی کا معلم اور زندگی کا مصلح بھی ہے۔

ایسے مصلحین و معلمین کے ہاتھوں میں جب اقتدار کا لٹھ آ جاتا ہے تو وہ عقل کل بن بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہترین مفکر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ہر سرچشمہ علم سے بے نیاز ہو کر اور معاشرے کے بہترین زیرک اور حساس عناصر کو برطرف رکھ کر اندھا دھند غیر معقول اقدامات کرنے لگتے ہیں جن میں سے ہر اقدام ایک خوفناک حادثہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ تشدد کے ہتھیاروں سے انسان کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور زندگی کی پیٹھ پر کوڑے برسا برسا کر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات اصلاح و انقلاب کے ایسے مدعیوں کو سرے سے انسان کی فطرت کا پتہ نہیں ہوتا۔ انہیں زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کے موجبات کا مبتدیانہ علم بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے کبھی یہ کاوش ہی نہیں کی ہوتی کہ انسان کو انسانیت سکھانے کے صحیح طریقے کیا ہیں اور بگاڑ کا سرچشمہ کہاں واقع ہے اور اس کی اصلاح کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اور اس کی تکمیل کہاں جا کے ہوتی ہے۔ وہ سابق تجربات سے

فائدہ اٹھائے بغیر اپنا تجربہ الف با سے شروع کرتے ہیں۔ وہ مشورہ و تنقید کے دروازے بند کردیتے ہیں تا کہ ان کا کوئی خیر خواہ اور انسانیت کا کوئی محب ان کے مہلک تجربے کی تکمیل میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ ان کے پاس ہر دور کی ایک ہی دوا ہوتی ہے...... جبر و تشدد! سخت ترین قوانین بنانا، نت نئے کڑے احکام جاری کرنا، عوام الناس کے چاروں طرف قدغنیں کھڑی کرنا اور پھر ان کی توضیع بار بار اپنے غیظ و غضب کے تازیانے سے کرتے رہنا!!

محسن انسانیتؐ نے جو انقلاب برپا کیا۔ اس کی روح تشدد کی روح نہ تھی۔ محبت و خیر خواہی کی روح تھی۔ حضورؐ انسانیت کے لئے حد درجہ رحم دل تھے اور ابنائے آدم کے ساتھ آپؐ کو سچا پیار تھا۔ اپنی دعوت کی نوعیت کو آپؐ نے مثال دے کر سمجھایا کہ تم لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے کی طرف لپکتے ہو اور میں تم کو کمروں سے پکڑ پکڑ کر بچانے کی کوشش کر رہا

ہوں۔ قرآن نے اسی لئے آپ کو پیغامبر رحمت قرار دیا۔ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ ہستی اتنا عظیم انقلاب لاتی ہے مگر تشدد سے کام لینے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ مدینہ حضورؐ کی دس سالہ زندگی میں سنگین درجے کی ایمرجنسی کے زیر سایہ رہا ہے۔ ہر آن حملے کا خطرہ رہتا۔ قریش نے تین بار بڑے بڑے حملے کئے۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں اور سرحدی آویزشوں کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ متفرق قبائل مدینہ پر دھاوا بولنے کے لئے کبھی ادھر سے سر اٹھاتے کبھی ادھر سے۔ بار بار طلایہ گردی کرنے اور فتنوں کی سرکوبی کے لئے مدینہ سے فوجی دستوں کی ترسیل ہوتی۔ راتوں کو فوجی پہرہ لگایا جاتا۔ غرض کہ ایک جنگی کیمپ کی سی زندگی تھی۔ اس پر مستزاد یہود اور منافقین کی سازشیں تھیں..... جنگ کی سازشیں، اسلامی معاشرہ کو پھاڑ دینے اور مختلف عناصر کو ٹکرا دینے کی سازشیں، حضورؐ کی قیادت کو ناکام کرنے کی سازشیں اور پھر اس زندگی بخش ہستی کو قتل

کردینے کی سازشیں۔ ایمرجنسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا عالم ہوسکتا ہے۔ مگر حضورؐ نے نہ کبھی اپنے لئے کوئی مستبدانہ اختیار حاصل کیا۔ نہ کوئی ہنگامی آرڈیننس جاری کیا۔ نہ کوئی جابرانہ ایکٹ نافذ کیا۔ نہ کسی ایک فرد کو نظر بندی میں ڈالا۔ نہ کوئی ہنگامی عدالتیں بٹھائیں، نہ تازیانے برسا کر لوگوں کی کھال اُدھیڑی، نہ جرمانے اور تاوان ڈالے۔ نہ کسی شہری پر کوئی بار حدِ الٰہی قانون سے تجاوز کر کے ڈالا۔ نہ اختلاف اور تنقید کا حق سلب کیا۔ نہ کسی کی زبان بندی کی اور نہ کسی پر پابندی عائد کی۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن ابی جیسے فتنہ پرواز تک سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سارا دارومدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا۔ کبھی کسی پر دھونس نہیں جمائی۔ کبھی رعونت نہیں دکھائی۔ کبھی کسی انسانیت کی تحقیر نہیں کی۔ کبھی اکڑفوں سے کام نہیں لیا بلکہ دوسروں کی...... جو درحقیقت کمزور اور بے بس تھے ...... رعونتوں کو صبر سے برداشت کیا۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کے دل مسخر ہوجاتے تھے۔

ساتھ آنے والے دیدہ و دل فرش راہ کرتے تھے۔ مخالفت کرنے والے اپنے آپ کو پست اور ذلیل محسوس کرتے تھے اور پھر جب حضورؐ کی صداقت و شرافت کے آگے سر جھکا دیتے تھے تو ان میں ایسی تبدیلی آتی تھی کہ گویا کایا پلٹ ہو گئی۔

حضورؐ کے سینے میں خدا کی جو محبت کارفرما تھی اسی کا دوسرا روپ یہ تھا کہ حضورؐ انسانیت سے گہری محبت رکھتے تھے۔ اس محبت انسانی کا اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں جو محسن انسانیتؐ کے سینے میں کارفرما تھی تو ہم اس واقعے سے کر سکتے ہیں کہ وہی مکہ جس کے باسی جنگ کی تلوار لئے آپؐ کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ اس پر قحط کا زمانہ آتا ہے تو آپؐ غلہ کی رسد جاری کراتے ہیں اور اسی شہر کے غرباء کے لئے پانچ سو اشرفی نقد بھجواتے ہیں۔ آپ کی محبت انسانی کا اندازہ ہم اس واقعے سے بھی کر سکتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کی کراہیں گوش مبارک تک پہنچیں تو حضورؐ کی نیند اڑ گئی اور آپؐ اس وقت تک آرام سے سو نہ سکے جب

تک کہ ان کے بندھن ڈھیلے کر کے انہیں آرام نہ پہنچا دیا گیا۔

آپ کی محبت انسانی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدی ایک اپیل پر حضورؐ کے اشارے پر رہا کر دیے جاتے ہیں اور پھر آپؐ کی محبت انسانی کا اندازہ کرنا ہو تو فتح مکہ کے موقع پر اس کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھئے۔ انسانیت کا محسن مکہ میں کامل فاتحانہ شان سے داخل ہوتا ہے اور اس کے خلاف بیس برس تک لڑنے والے دشمن اس کے سامنے بے بس ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا۔ قتل عام کا حکم جاری کرتا اور خون کی ندیاں بہا دیتا۔ کشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ ٹلتا۔ وہ لوگ عرفاً، قانوناً، اخلاقاً ہر لحاظ سے مجرم تھے اور دین و سیاست دونوں لحاظ سے گردن زدنی۔ مگر اس لمحے حضورؐ کی محبت انسانی ابھرتی ہے اور قریش کے مظالم کی ساری تاریخ پر خط عفو پھیر کر کہتی ہے کہ "لا تثریب علیکم الیوم! اذھبوا انتم الطلقاء!!" الغرض ان کی تالیف قلب کے لئے

حضورؐ ان کو مال و دولت عطا کرتے ہیں اور ان کو ذلیل اور مسترد کرنے کے بجائے ان کو ذمہ داریاں سونپتے ہیں اور گلے لگا لیتے ہیں۔ حضورؐ پر یہ حقیقت روشن تھی کہ جو انقلاب انتقام پر اتر آتا ہے وہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے اور جو انقلاب عفو اور دلبری سے کام لیتا ہے وہ دشمنوں کو رام کرتا ہے اور مزاحمت کرنے والوں کو خادم بنا لیتا ہے۔

یہ قریش کا ذوق تشدد تھا جس کے تحت انہوں نے محسن انسانیت کو مجبور کردیا کہ ان کی تیغ خون آشام کی دھار توڑ دی جائے اور جنگ کے سر آپڑنے پر حضورؐ نے نظام حق کے بچاؤ میں پوری طرح بازی لگادی۔ مگر حضورؐ کی محبت انسانی نے جنگی پالیسی اور دفاعی تدابیر ایسی نکالیں کہ کم سے کم جانی نقصان ہوا ورکم سے کم خون بہے۔ نیز حضور اکرمؐ نے کڑا اہتمام کیا میدان جنگ میں بھی انسانیت کا احترام برقرار رہے۔

محبت انسانی کی ایسی روشن اور وسیع مثال کسی دوسرے انقلاب میں نہیں ملتی۔ حضورؐ کا انقلاب خالص تعلیمی انقلاب تھا اور اس کی اساس بنی آدم کی خیر خواہی پر تھی۔

نیا انسان:

بے شمار اصلاحی اور تعمیری اور انقلابی تحریکیں ہمارے سامنے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک نے انسان کو جوں کا توں رکھ کر خارجی نظام کو بدلنے کی تدبیریں کی ہیں لیکن ہر وہ تبدیلی حقیقی مسائل حیات کو حل کرنے کے لحاظ سے بالکل رائیگاں رہی جو انسان کو اندر سے نہیں بدل سکی۔ محسن انسانیت کے کارنامے کا مبہوت کر دینے والا یہ پہلو بڑا ہی اہم ہے کہ انسان اندر سے بدل گیا اور یکسر بدل گیا۔ انسانی روپ میں جو خواہش پرست حیوان پایا جاتا تھا کلمہ حق کے اثر سے وہ بالکل مٹ گیا اور معاً اس کی راکھ سے خدا پرست اور با اصول انسان ابھر آیا۔ اس نے

انسان کے کردار کی درخشانی دیکھئے تو آنکھوں میں چکا چوند آ جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ جیسا مکہ کا ایک تند خو نوجوان بدلا تو کہاں پہنچا! فضالہ میں تبدیلی آئی تو کس شان سے آئی! ذوالبجادین کو دیکھئے کہ کس طرح دولت و آسائش کو لات مار کے درویشانہ زندگی اختیار کرتا ہے! حضرت ابوذرؓ کو لیجئے کیا انقلابی جذبہ ہے کہ کعبہ میں کھڑے ہو کر جاہلیت کو چیلنج کیا اور خوب مار کھائی۔ کعبؓ بن مالک کا کردار دیکھئے، ابوخیثمہؓ کا رنگ ملاحظہ فرمایئے۔ لبینہؓ اور سمیہؓ جیسی کنیزوں کی انقلابی شجاعت و عزیمت پر نگاہ ڈالئے، ماعزؓ بن مالک اسلمی اور غامدیہؓ پر توجہ کیجئے نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ کی جرأت سے سبق لیجئے۔ ایرانی سپہ سالار کے دربار میں ربعیؓ بن عامر کی شان استغنا سے روح افروز کیجئے...... اور تاروں کے اس جھرمٹ میں سے کون ہے جس کا ایمان لمحہ قلمن نہیں ہے۔

ان ہستیوں سے وہ معاشرہ بنا اور ایسے قائدین اور

کارکنوں کے ہاتھوں وہ نظام حق چلا جس نے اگر بندش شراب کی منادی کی تو ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے فوراً الگ ہو گئے اور بہترین شرابوں کے مٹکے گلیوں میں لنڈھا دیئے گئے۔ جس نے اگر عورتوں کو سر و سینہ ڈھانپنے کا حکم دیا تو حکم ملتے ہی کسی تاخیر کے بغیر دوپٹے اور اوڑھنیاں بنالی گئیں۔ جس نے اگر جہاد کے لئے پکارا تو نوعمر لڑکے تک ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کر یہ کوشش کرتے دکھائی دیئے کہ وہ واپس لوٹائے جانے سے بچ جائیں۔ جس نے اگر چندہ طلب کیا تو جہاں حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند تاجروں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں لا لا کر کھڑی کر دیں اور حضرت ابو بکرؓ جیسے فدائیوں نے گھر کی ساری متاع تحریک کے قدموں میں ڈال دی۔ وہاں ایسے مزدور بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی مزدوری سے حاصل شدہ کھجوریں جنگی فنڈ میں دے کر دامن جھاڑ دیا۔ جس نے اگر مہاجرین کی بحالی کے لئے انصار کو پکارا تو انہوں نے اپنے

مکان اور کھیت اور باغ آدھوں آدھ بانٹ دیئے اور اخوت کا

ایک بے مثال سماں پیدا کر دیا۔ جس نے اگر عہدوں کو خدمت

کی روح سے بالاتر کر کے معمولی مردوں کے لئے کارکن طلب

کئے تو ایک درہم روز کے قلیل معاوضے پر کورنری کے فرائض

انجام دینے والے حکام دنیا کے سامنے نمودار ہوئے۔ جس نے

اگر مال غنیمت کو سپہ سالار کے پاس جمع کرانے کا حکم دیا تھا شان

سے تعمیل کی گئی کہ فوج ایک ایک سوئی اپنے افسر کو پیش کر دیتی

تھی، اور یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں درخشاں رہے گا کہ مدائن کے

اموال کا ایک قیمتی حصہ عام سپاہی کے ہاتھ آتا ہے اور بغیر

اس کے کہ کسی کو بھی اس خزانہ زر و جواہر کا علم ہو، وہ رات کی

تاریکی میں چپکے سے اپنے سردار تک پہنچ دیتا ہے۔ یہ ہستیاں

تھیں جنہوں نے نیکی کا ایسا ماحول تیار کیا کہ جس میں شاذ و نادر

ہی جرائم ہوتے تھے، اور حضورؐ کے پورے دہ سالہ دور میں گنتی

کے مقدمات عدالتوں میں آئے۔ یہ نیکی کا ایسا ماحول تھا جس

میں کوئی سی۔ آئی۔ ڈی نہیں رکھی گئی بلکہ لوگوں کے ضمیر ہی ان کے پاسبان اور نگراں بن گئے۔

یہ تھا وہ انقلاب جس نے باہر کے نظام کے ساتھ ساتھ اندر سے انسانی قلب و ذہن کو بدلا اور نیا کردار پیدا کر دیا۔ اسی لئے وہ حقیقی اور بنیادی مسائل حیات کو حل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کے ذریعہ وقت کے تمدنی بحران میں راہ نجات پیدا ہوئی۔

محسن انسانیت کا عظیم ایثار:

یہ انقلاب اس لحاظ سے بھی لاجواب ہے کہ اسے برپا کرنے والے نے اگرچہ بے انتہا قربانیوں سے اس کی تکمیل کی لیکن اس نے کوئی صلہ اور کوئی عوضانہ نہیں لیا۔ اپنا سب کچھ انسانیت کی بھلائی کے لئے دے دیا۔ اس نے اتنا کچھ بھی نہیں لیا جتنا اگر لیا جاتا تو عقلاً، شرعاً، عرفاً ہر طرح جائز اور روا ہوتا۔

اتنے بڑے کارنامے پر ذاتی غرض و لوث کا خفیف سا دھبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہے کوئی اس کی مثال؟

معاشی لحاظ سے دیکھئے کہ حضورؐ نے اپنی کامیاب تجارت قربان کی، اس سے حاصل شدہ سرمایہ لپنے مشن پہ نچھاور کیا اور جب کامیابی کا دور آیا تو دولت کے ڈھیر اپنے ہاتھوں سے صرف اور تقسیم کئے مگر اپنے گھر کے لئے فقر وفاقہ اور سادہ سی گزران کا عالم پسند کیا۔ اپنے گھر والوں کے لئے کوئی اندوختہ نہیں چھوڑا، کوئی جائداد نہیں بنائی اور ان کے کوئی بالاتر مالی حقوق قائم نہیں کئے اور ان کے لئے کسی عہدے کی مستقل موروثی گدی نہیں چھوڑی۔ دربان اور خادم بھرتی نہیں کئے۔ سواریاں جمع نہیں کیں۔ کوئی سامان آرائش گھر میں پسند نہیں کیا۔

سیاسی لحاظ سے دیکھیں تو اپنے لئے کوئی ترجیحی حقوق

حاصل نہیں کئے۔ کسی کے خلاف خدا کے احکام وحدود سے تجاوز کر کے کوئی اختیار استعمال نہیں کیا۔ اپنا سیاسی مقام اونچا کرنے کے لئے کوئی من مانا قانون جاری نہیں کیا۔ مدینہ میں شدید ایمرجنسی موجود رہی اور یہود منافقین کی نت نئی شرارتوں سے سابقہ رہا مگر کسی کو نظر بند نہیں کیا۔ کسی پر پابندی نہیں لگائیں، کوئی ضمیر کش احکام نافذ نہیں کئے۔ ہنگامی عدالتیں نہیں بٹھائیں اور لوگوں کی چمڑی تازیانے سے نہیں ادھیڑی۔ بخلاف اس کے لوگوں کو تنقید اور رائے زنی کا حق دیا۔ اختلاف کرنے کی آزادی دی۔ اپنے اعلیٰ مشوروں کو قبول نہ کرنے کا حق بھی دیا۔ یہ حقوق محض کاغذ پر لکھے ہوئے نظری حقوق نہ تھے بلکہ لوگوں نے ان حقوق کو عملاً استعمال کیا۔ بسا اوقات حضورؐ نے اپنی قیمتی رائے ترک کر کے اختلافی رائے قبول فرمائی۔ اگر کسی کو کوئی رعایت دینا چاہی تو جماعت سے اجازت طلب کی۔ مثلاً اپنے داماد جناب ابو العاص قیدی بن کر آئے تو ان کے فدیہ میں حضرت

زینب نے وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ کی یادگار تھا۔ اس ہار کی واپسی کے لئے حضورؐ نے مجلس عام میں اپیل کی۔ اسی طرح ان کا مال بطور غنیمت لایا گیا تو وہ جماعت کی اجازت سے واپس کر لیا۔ جعرانہ کے مقام پر معرکہ حنین کے قیدیوں کو چھوڑنے کے لئے ایک وفد آیا۔ جس نے حضورؐ کی رضاعی قرابت کا واسطہ دلا کر اپنی درخواست پیش کی۔ قیدی تقسیم ہو چکے تھے۔ حضورؐ نے بنو ہاشم کے حصے کے قیدی چھوڑنا تو بطور خود منظور کیا لیکن بقیہ کے لئے فرمایا کہ مجمع عام میں مسلمانوں سے درخواست کرو۔ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اپنے خاندان کے حصے کے قیدی چھوڑ دیے ہیں تو سب نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ایسے معاملات میں حضورؐ نے کبھی بھی دباؤ اور جبر سے کام نہیں لیا۔ سماجی اور مجلسی لحاظ سے دیکھئے تو اپنے لئے مساوات پسند کی۔ امتیاز پسند نہیں کیا۔ نہ کھانے پینے رہن سہن، لباس اور وضع قطع میں کوئی غیر معمولی پن رکھا۔ نہ مجالس میں نمایاں مقام پر نشست

پسند کی۔ نہ یہ مرغوب تھا کہ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوں اور نہ آقا اور سردار اور اسی طرح کے القاب احترام استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ اور سفر میں بھی، خندق کی کھدائی میں بھی اور مساجد کی تعمیر میں بھی اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر مٹی ڈھونے، گارا اٹھانے، پتھر توڑنے اور لکڑیاں چننے کے کام اپنے دست مبارک سے سرانجام دیئے۔ قرض خواہوں کو عالم واقعہ میں اپنے خلاف درشتی سے تقاضا کرنے کا اذن دیا۔ اپنے آپ کو مجلس عام میں انتقام کے لئے پیش کیا کہ جس کسی کے خلاف مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو وہ مجھ سے اپنا بدلہ لے لے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

محسنِ انسانیت کا یہ مقدس انقلاب تھا جس کے ہم پاسبان بنائے گئے تھے۔ یہ پیغام تھا جس کے لئے ہمیں شہداء علی الناس اور امت وسط ہونے کے بلند ترین منصب پر فائز کیا

گیا تھا۔ یہ تھا کلمہ حق جس کی امانت ہمیں اس لئے تفویض کی گئی تھی کہ حضورؐ کی نیابت میں ہم قیامت تک انسانیت کے نجات دہندہ بنیں اور جب بھی زندگی اپنے مسائل میں الجھ جائے اور تمدن بحران میں گھر جائے تو ہم اس کے لئے سہارا بنیں لیکن ہم نے اس کلمہ حق کی مشعل کو بلند رکھنے میں کوتاہی کی اور اس نظام حق کا اپنے ہاتھوں صفایا کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ دورِ حاضر کا قافلہ فکر بھٹک کے غلط موڑ مڑا، تو ہم اپنا فرض ادا کرنے کے اہل نہ تھے اور ہماری ہی کوتاہیوں کا کرشمہ ہے کہ آج پوری حیات انسانی بحران کا شکار ہے۔ متضاد مادہ پرستانہ نظریات کی آویزش ذہنی سکون کو برباد کر رہی ہے۔ عالمی قیادت خدا ناشناس طاقتوں کے ہاتھ میں ہے اور ہم خود انہی طاقتوں کے دریوزہ گر بن کر رہ گئے ہیں۔ حالات کی ٹھوکریں ہمیں بیدار نہیں کر سکیں۔ ذلتیں اور نامرادیاں ہمارے اندر احساس ندامت ابھار نہیں سکیں۔ عالم اسلام کا انتشار اور انسانیت کا

بحران ہمیں اسی کرنے کے اصل کام پر توجہ نہیں دلا سکا۔

آؤ سوچیں اور جائزہ لیں کہ انسانیت تاریخ کے کس مرحلے سے گزر رہی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟

اس کتاب کے مؤلف نے اپنے مختصر سے دورِ عمر میں اپنے آپ کو بھی، اپنے قریبی ماحول کے ابنائے نوع کو بھی، اور اس سے آگے گزر کر دنیا بھر کے انسانوں کو بھی مسلسل ایک پریشانی، ایک اضطراب، ایک تنگی ایک تشویش اور ایک خوف کی حالت میں گرفتار دیکھا ہے۔ گھر سے لے کر بین الاقوامی تنظیموں تک ہر جگہ بدگمانی، کھچاؤ، کشمکش اور تصادم کا سماں سامنے آیا ہے۔ اس پورے دور میں تاریخ ایک ہنڈیا کی طرح ابال کھاتی رہی ہے اور اس ہنڈیا کے کھولتے ہوئے پانی میں اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کے انبوہ کے ساتھ خود کو بھی مٹر یا چاول کے ایک دانے کی مانند زیر و زبر ہوتے پایا ہے۔ جس انسانی دنیا سے

اب تک سابقہ رہا ہے وہ دو عالمی جنگوں کے درمیان پس کر اور بے شمار علاقائی جنگوں کے چرکے کھا کھا کر ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی کہ ایک اور قیامت خیز جنگ کی تلوار اس کے سر پہ لہراتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس مختصر سے دور میں توڑ پھوڑ کے بیشمار ہنگامے نظر سے گزرے۔ بار بار انقلابوں کے بھونچال آتے رہے۔ سلطنتوں کو ابھرتے دیکھا مٹتے دیکھا۔ نظریات کی لہروں کی آویزش دیکھی۔ سازشوں کی سرنگیں پھٹتی اور چھٹتی دیکھیں۔ علاقوں کے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ انسانی گلوں کو اجڑ اجڑ کر نقل مکانی کرتے دیکھا۔ خود برصغیر ہندو پاک میں عین صبح آزادی کے ظہور کے ساتھ بالکل اپنے سر سے موج خون گزرتی دیکھی اور اس موج خون میں انسانی جانوں، عصمتوں اور آبروؤں اور قیمتی روایات واقدار کو غرق ہوتے دیکھا۔

موجودہ عالم گیر مادہ پرستانہ تہذیب کے ظاہر فریب پردوں کے پیچھے جھانک کر انسانیت کا جائزہ لیجئے تو وہ حال زار

سامنے آتا ہے کہ روح کانپ جاتی ہے۔ پوری اولاد آدم کو چند خواہشات نے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے اور ہر طرف دولت اور اقتدار کے لئے ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ آدمیت کے اخلاقی شعور کی مشعل گل ہے۔ جرائم تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نفسیاتی الجھنوں کا زور ہے اور ذہنی سکون یکسر غائب ہو چکا ہے۔ انسانی ذہن و کردار میں ایسا بنیادی فساد آ گیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی نحوست کی پرچھائیں سے محفوظ نہیں رہا۔ فلسفہ و حکمت سے سچائی کی روح کھو گئی ہے...... اعتقادات و نظریات میں توازن نہیں رہا۔ روحانی قدریں چوپٹ ہو چکی ہیں۔ قانون روح عدل سے خالی ہو رہا ہے۔ سیاست میں جذبۂ خدمت کی جگہ اغراض پرستی گھس گئی ہے۔ معیشت کے میدان میں ظالم اور مظلوم طبقے پیدا ہو گئے ہیں۔ فنون لطیفہ میں جمال کی ساری رنگ آمیزیاں جنسی جذبوں اور سفلی خواہشوں سے کی جانے لگی ہیں۔ تمدن کے سارے عوالم میں جِیچ پر تضادات

ابھر آئے ہیں جن کے درمیان تصادم برپا ہے اور پوری تاریخ ایک خوفناک ڈرامے میں بدل گئی ہے۔ عقل ترقی کر گئی ہے مگر اس کی حماقتیں ہمارے درپے آزار ہیں۔ علم کے سوتے ابل رہے ہیں مگر اسی کی پروردہ جہالتوں کے ہاتھوں آدم زار کا دم ناک میں ہے۔ دولت کے خزانے ہر چہار طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مگر خدا کی مخلوق بھوک، ننگ اور محرومی کے عذاب میں گھری ہے۔ ہزار گونہ تنظیمیں اور سیاسی ہیئت نظریاتی وحدتیں اور معاہداتی رابطے نمودار ہیں مگر انسان اور انسان کے درمیان بھائی بھائی کا سا تعلق نہیں۔ چیتے اور بھیڑیئے کا سا معاملہ ہے۔ عقلی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی شعور کی ترقی کے چرچے ہیں مگر ظلم اور تشدد کے انتہائی ناپاک حربے آج بھی انسانیت کے خلاف کام میں لائے جا رہے ہیں۔ تاریخ ایک وسیع اکھاڑا ہے جس میں کہاں امپیریلزم اور حریت پسندی کے درمیان، کہیں کمیونزم اور سرمایہ داری کے درمیان کہیں جمہوریت اور آمریت کے

درمیان کہیں فرد اور اجتماعیت کے درمیان اور کہیں مغربیت اور ایشیائیت کے درمیان ایک خوفناک آویزش ہو رہی ہے۔

ایسی ہے یہ دنیا جس میں ہم اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں!

مصنوعی سیاروں اور میزائیلوں کے اس دور میں سائنس الہ دین والے روایتی چراغ کے جن کی طرح مادی قوتوں کے نئے نئے خزانے انسان کے ایک ایک اشارے پر بہم پہنچا رہا ہے۔ قدرت کے سربستہ رازوں کے ازلی قفل حکمت کی کنجی سے کھل رہے ہیں۔ ہیبت ناک رفتاریں انسان کو زمان و مکان پر وسیع تصرف ایک اشارۂ ابرو کے منتظر ہیں۔ دوسری طرف خود اس انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ شیطان اور تخریبی قوتوں کے پنجے میں پہلے سے زیادہ بے بس دکھائی دیتا ہے جو بار بار اسے اپنی ہی خلافت محشر آرا کرتی رہی ہیں اور جنہوں

نے ہر دور تاریخ میں اس عظیم تعمیری کارناموں اور اس کے شان دار تمدنوں کو خود اسی کے ہاتھوں ملیامیٹ کرلیا ہے۔

ذرا کسی ایسے کارواں کا تصور کیجئے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر ڈیرہ ڈالے اور زرق برق خیمے نصب کرکے کھانے پینے، رقص اور موسیقی اور شعروشراب میں مگن ہو اس کے پاس کاروباری اموال کے انبار ہوں۔ اس کے ساتھ روپے سے بھری ہوئی تھیلیاں ہوں، جانوروں اور سواریوں کی کثرت ہو۔ اس کے اسلحہ چمک دار اور اس کا چہرہ مضبوط ہو...... لیکن عین اس کے قالینوں اور بستروں اور مسندوں کے نیچے کی زمین میں چند فٹ کی گہرائی پر خوفناک لاوا کھول رہا ہو اور تھوڑا ہی وقفہ اس میں باقی ہو کہ پہاڑ پھٹ پڑے اور آگ کا طوفان اٹھنے لگے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے قافلہ تمدن کا ہے جو موجودہ لمحۂ تاریخ کی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اس پہاڑی کے سینے میں ہولناک ترین بحران کا لاوا کھول رہا ہے۔

ہمارے سامنے مشیت عالمی بحران کا چیلنج لئے کھڑی

ہے۔ وقت کے راستے پر پیچھے بھاگنے کا امکان نہیں۔ چیلنج کا

جواب دینے کی صلاحیت موجودہ مادی تہذیب اور اس کے

بنائے ہوئے انسان میں نہیں ہے۔ کوئی نیا فلسفہ نہیں ابھر رہا ہے

جو کم سے کم ایک چھلاوے کی طرح وقتی طور پر ہی سرمایہ اطمینان

بن سکے۔ کسی طرف سے کوئی راہ نجات کھلتی نظر نہیں آتی۔

اضطراب کے اس لمحے میں جب میں چاروں طرف

نگاہیں گھماتا ہوں تو تاریکی کا ایک سمندر شش جہت سے محاصرہ

کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس سمندر میں دور...... تیرہ صدی

کی دوری پر...... ایک نقطہ نور دکھائی دیتا ہے۔

یہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن محمد صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے پیغام کی مشعل ہے!

وہی مشعل جس کی روشنی کو خود ہم نے...... محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کے نام لیواؤں نے ...... اپنے افکار پریشاں اور اپنے اعمال پراگندہ کے غبار میں گم کر رکھا ہے!

مطالعۂ سیرت کا نقطۂ نظر:

میرے نزدیک سیرت پاک کے مطالعہ کا ایک ہی مقصود ہے۔ حضورؐ کے پیغام کی مشعل ہمارے سامنے اور پوری انسانیت کے سامنے ایک بار پھر نور پاش ہو اور قافلۂ زندگی دور حاضر کی تاریکیوں میں اسی طرح جادۂ فلاح کا سراغ پالے جس طرح سے چھٹی صدی عیسوی کے بحران سے نجات پانے کا راستہ ملا تھا۔

بدقسمتی سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ ہمارے ہاں اس اسپرٹ اور اس نقطۂ نظر سے کم ہو رہا ہے جس سے ہونا چاہئے۔ ہماری دلچسپی اس میدان میں پوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہمیں وہاں سے ایک نقشۂ زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو

اس کے سانچے میں ڈھالتا ہے بلکہ بعض دوسری دلچسپیاں بیچ میں آ گئیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ساری دلچسپی مجرد حصول ثواب کے لئے رکھتے ہیں (اس سے انکار نہیں کہ حضورؐ سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے، اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیئے لیکن ایسی کوشش کا اولین مدعا زندگی کو سنوارنا بھی تو ہو) دھوم دھام سے میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور اس اعتقاد سے کی جاتی ہیں کہ ان مجالس میں حضورؐ کی روح پر نور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی محبت کے مظاہروں کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرینی کے طشت، پھولوں کے گجرے اور ہار، قوالی اور نعت خوانی کے اہتمام، اگر بتیوں اور لوبان کی خوشبوؤں کے مرغولے، قمقموں اور فانوسوں کی لمعہ پاشیاں، یہ سب کچھ اسی اعتقاد کی ترجمان ہیں۔ سیرت نبویؐ سے اس انداز کی عقیدت جو

نقشہ سامنے لاتی ہے وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں۔ گوشت پوست

سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق

الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا

ہے جس کے جسم کا سایہ نہیں، جس کے کارنامے میں سارا پارٹ

معجزوں کا ہے جو عالم اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے جس

کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہر بات

اور ہر چیز پر اسرار ہے۔ انکار نہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلہ میں

حضورؐ کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے۔ وہاں بہت سی فوق

العادۃ چیزیں بھی ملتی ہیں، وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے

بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں...... مگر بہرحال وہ پاک زندگی

ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے

کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانین

فطرت اور نوامیس قدرت مشیت ہی کے دائرے میں سارا کام

ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چپے پر قربانیاں پیش کی

جاتی ہیں۔ وہ ایک انسان کی زندگی ہو کر ہی ہمارے لئے اسوہ
بنتی ہے اور اسی تصور کے ساتھ ہم اس سے اکتساب کرسکتے ہیں۔
اس سے عزم و ہمت کا درس لے سکتے ہیں۔ اس سے اصول کی
پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں، اس سے انسانیت
کی خدمت کا جذبہ اخذ کرسکتے ہیں اور اس سے بدی کی طاقتوں
کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لئے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا
کرسکتے ہیں۔ سیرت نبوی کو اگر تم معجزہ بنادو گے اور اگر اسے فوق
الانسانی کارنامے کا رنگ دے دو گے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے
انسانوں کے لئے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے
سامنے ہم مرعوب اور حیرت زدہ تو ہوسکتے ہیں۔ اس کا کوئی پرتو
اپنے اندر جذب نہیں کرسکتے۔ اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے
ہیں اس کا اتباع نہیں کرسکتے۔ چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی
کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے۔ وہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔
عملی زندگیاں اتباع نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہے۔

بلکہ الٹا حالت یہ ہے کہ گھناؤنے معاشی و معاشرتی جرائم کے میکدے میں جو لوگ خم کے خم لنڈھاتے ہیں وہ اس سستے طرز سے مظاہرۂ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ع

"کچھ بھی نہیں، لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں"

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان آگھسا ہے جسے اعاظم پرستی (Hero Worship) کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تفاخر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کراتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی ہستیاں ہیں۔ ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور

جو ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایام وفات، ایام پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ نہیں بنتے۔ انسانیت کے جن نمونوں کو بصد تفاخر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ان کا کوئی پرتو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پرتو کو اخذ کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ اس رجحان کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ کرنے کے لئے جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کی جاتی ہے مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطہ نظر وہ ہے جو حضورؐ کے پیغام کو ایک نظام حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضورؐ کس

چند اعتقادات، چند رسوم عبادات، چند اوراد و وظائف چند
اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپؐ کا
منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر مسلمانی کی شان پیدا
کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لئے بہترین کارکن
ثابت ہوں۔ ایسا عنصر حضورؐ سے بس طہارت، نماز روزے،
نوافل و اذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک اکتساب فیض کرتا ہے
لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں پوری شان بے حسی
کے ساتھ ہر باطل کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری
کر لیتا ہے اس عنصر نے گویا سیرت نبویؐ کی مقدس کتاب کے
بے شمار زریں ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور
بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر
نے اب تک حضورؐ کی جو ترجمانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دور
حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا، خود تعلیم یافتہ نوجوان مسلم تک یہ تصور
بھی نہیں کر سکتے کہ حضورؐ ان کے لئے قافلہ سالار تمدن بھی

ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل بھی مل سکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر بھی حضور کی ہستی کے لئے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہائے نظر چنپ اس لئے رہے ہیں کہ فضا ان کے لئے سازگار ہے۔ فضا یوں سازگار ہے کہ جس نظام سیاست وتمدن اور جس ہیئت معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں اسے ایک خاص نقشے کا انسان درکار ہے۔ اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و کردار سے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نمونۂ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پیش کرتی ہے اور اس منڈی میں اس متاعِ فکر و عمل کی مانگ ہی نہیں ہے جو آنحضور کی زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دنیا کا اجتماعی نظام جس طرز کے وزیر

اور حکام، جج اور وکیل، لیڈر اور صحافی، سپہ سالار اور سپاہی، کوتوال اور پیادے، تحصیل دار اور پٹواری، ڈپٹی کمشنر اور نمبردار، زمیندار اور مزارع، مصنف اور ادیب اور عام قلی اور مزدور مانگتا ہے، ان کا نقشۂ انسانیت اس سے بالکل متضاد قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاریخ کے اسٹیج پر فرمایا۔ چھائے ہوئے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماؤں کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ اس کی ضرورت کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت بیس بیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پرزے بنا رہے ہیں اور اسی کے تقاضوں کے تحت ہر صاحب شعور خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ جن جن چیزوں کو حقارت و کراہت سے دیکھتا ہے ماحول کی پوری طاقت ان کو

مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے، زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں۔ یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود زیب بدن ہونے لگتے ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے جسے مروجہ نظام رائج کرنا چاہے، وہ ذلت کا طرز وہ قرار پایا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعہ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ نذر تغافل ہوجاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بناتا اور تمام افراد سے انہیں منواتا ہے اور دوسری تمام روایات، اقدار اور شعائر کو مرجھانا پڑتا ہے۔ کچھ حمیت دار افراد اور خاندان ماحول کے جبری دھارے کے خلاف زور کرتے ہیں مگر معاشی محرومی، ثقافتی پسماندگی اور احساس کہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھر اک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں۔ ورنہ ان کی اگلی نسل ہمت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی

سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے منشا کے مطابق کرنے میں مگن ہے۔ وہ سرورِ عالم کی سیرت پر کتابیں اگر لکھیں اور پڑھیں گے اور وعظ سنائیں اور سنیں گے تو اسوۂ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر آئے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرتِ نبویؐ میں ان لوگوں کے لئے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سودے کسی باطل سے چک گئے ہوں۔ یہ لوگ سیرت پڑھ کر سر دھنتے ہوں گے ان کو ذہنی حظ ملتا ہوگا۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہوگا لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا جمود کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستان حیات رستم و سہراب کا قصہ نہیں۔ الف لیلہ کی کہانی نہیں اور کسی

خیال کردار کا افسانہ نہیں۔ اس کا مقام یہ ہرگز نہیں کہ اسے ہم علم و ادب کی تفریحی چوپال کا محض ایک سرمایہ رونق بنائیں۔ اس کی قدر و قیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لئے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف نقطہ ہائے نظر ہمارے یہاں مل جل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہوتے ہوں گے؟ ایک ربیع الاول ہی کے مہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا میں لہریں اٹھا دیتی ہوں گی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہوں گی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے۔ شعراء کتنی نعتیں لکھتے ہوں گے اور قوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہوں گے؟ اکابر کی طرف سے کتنے ہی پیغامات اور

بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور ضیافتوں کی کتنی پُرتکلف بہاریں دسترخوانوں پر آتی ہوں گی؟ بازاروں کو سجانے اور دروازے اور محرابیں بنانے میں کتنا روپیہ کھپا دیا جاتا ہوگا؟

لیکن دوسری طرف یہ بھی ذرا سوچئے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے، جائزہ کی ترازو کے ایک پلڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھئے اور دوسرے پلڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچئے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہوں گے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرت نبویؐ کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی مہم میں ہر سال لگ جاتے ہوں گے؟ اگر ایک جلسے اور مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ گزشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہئے تھا اور اگر عملاً وہ حاصل وہ نہیں ہے تو کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے۔ اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی

ہے۔ رونا اس کا نہیں کہ وہ کچھ حاصل نہیں ہو رہا جو مطلوب ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ماتم اس کا ہے کہ ہمارے پلے وہ کچھ پڑ رہا ہے جو محسن انسانیتؐ کے پیغام اور کارنامے سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے۔ ہمارے اندر آج ایسے عناصر پروان چڑھ رہے ہیں جو حضورؐ کے مشن کو زمانۂ حال کے لئے ناکارہ اور حضورؐ کے عطا کردہ نظام زندگی کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔ ایسے عناصر جو حضورؐ کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں، ایسے عناصر جو سیرت اور سنت اور حدیث کا سارا ریکارڈ دریا برد کر دینا چاہتے ہیں۔ ایسے عناصر جو قرآن کو قرآن پیش کرنے والی ہستی کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور لاسول تحریکی کارنامے سے بے تعلق کر دینا چاہتے ہیں اور حضورؐ کی ہستی کے بطور عملی نمونۂ انسانیت کے ہماری نگاہوں سے گم کر دینے کے لئے کوشاں ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ تعبیر و تاویل کے نام پر ہمارے ہاں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ حضورؐ کی شخصیت، پیغام اور کارنامے کو موجودہ فاسد تہذیب کے

فکری سانچے میں ڈھال دیا جائے اور محسن انسانیت کی بالکل نئی تصویر عالمی طاقتوں کے ذوق کے مطابق تیار کر دی جائے۔

میرا حاصل مطالبہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعہ سیرت کا صحیح بنیادی نقطہ نظر گم کر دیا ہے۔ اور اوپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم ؐ کی محبت اور عقیدت کے بے شمار مظاہر موجود ہونے کے باوجود اور سیرت اور دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا ہے۔ جس کا نمونہ کامل حضورؐ نے پیش فرمایا تھا۔

حضورؐ کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتا کہ ہم اس نصب العین کے لئے ویسی ہی جدوجہد کرنے اٹھیں جس کے لئے حضورؐ کی وہ پری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جدوجہد اپنے ڈھب کی سیرت کرنے کا ذریعہ بھی

ہو سکتی ہے اور مصرف بھی!!

محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے جو کنارے بیٹھ کر محض اپنی انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کی آپ بیتی ہے جو ایک اجتماعی تحریک کی روح رواں تھی۔ وہ محض ایک انسان کی نہیں بلکہ ایک انسان سازی کی روداد ہے۔ وہ عالم نو کے معمار کے کارنامے پر مشتمل ہے۔ ایک پوری جماعت، ایک انقلابی تحریک اور ایک ہیئت اجتماعیہ اس کارنامے کی تفصیل اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ سرورِ عالمؐ کی سیرت غار حرا سے لے کر غار ثور تک حرم کعبہ سے لے کر طائف کے بازار تک، امہات المومنین کے حجروں سے لے کر میدان ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نقوش بے شمار افراد کی کتاب حیات

کے اوراق کی زینت ہیں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ، عمارؓ و یاسرؓ، خالدؓ و خویلدؓ اور بلالؓ و صہیبؓ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب ایک ہی کتاب سیرت کے اوراق ہیں۔ ایک چمن کا چمن ہے کہ جس کا لالہ و گل اور نرگس و نسترن کی ایک ایک پتی پر اس چمن کے مالی کی زندگی مرقوم ہے۔ وہ قافلۂ بہاری وقت کی جس سرزمین سے گزرا ہے اس کے ذرے ذرے پر نکہت کی مہریں ثبت کر گیا ہے۔

دنیا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد بنا کے پیش کیا جائے اور سوانح نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں، اس کی نمایاں مہمات اور اس کے اخلاق و عادات کو بیان کر دیا جائے۔ کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھوج کرید کر دی جائے تو ایسی سیرت نگاری سے صحیح منشا ہرگز پورا نہ ہوگا۔

پھر سرورِ عالم کی زندگی کی مثال ایک جوہڑ کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے ڈالیں۔ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے، روانی ہے کشمکش ہے۔ موج و حباب میں سیپیاں اور موتی ہیں اور جس کے پانی سے مردہ کھیتوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے۔ اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر اور معلومات ملتی ہیں لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جذبے انگڑائی نہیں لیتے، عزم و ہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا۔ ذوقِ عمل میں نئی حرارت نہیں آتی۔ ہماری زندگیوں کا جمود نہیں ٹوٹتا۔ وہ شرار آرزو و ہم اخذ نہیں کر پاتے جس کی گرمی نے ایک یکہ و تنہا اور بے سرو سامان فرد کو قرنوں کے جمے ہوئے فاسد نظام کے خلاف معرکہ آرا کر دیا۔ وہ سوز و سازِ ایمان ہمیں نہیں ملتا جس نے ایک یتیم بے نوا کو عرب و

عجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضورؐ معروف اصطلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک "بڑے آدمی" نہ تھے۔ آپؐ کی سیرت ایک ایسے "بڑے یا مشہور" آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی سلسلوں میں گنوایا جاتا ہے۔ یہ ہستی "بڑے" اور "مشہور" آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔

دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے اخلاق و قانون کے نظام سوچے...... وہ بھی ہیں جنہوں نے اصلاح معاشرہ کے کام کئے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے ملک فتح کئے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑ دی۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے سلطنتیں چلائیں۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے فقر و درویشی کے عجیب عجیب نمونے

ہمارے سامنے پیش کئے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے

انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا...... مگر

ایسے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو

بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا رس زندگی کی کسی

ایک شاخ نے چوس لیا اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔

ایک پہلو اگر بہت زیادہ روشن ملتا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک

دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط!

لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں

کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے اور پھر ہر گوشہ ایک ہی

طرح کے کمال کا نمونہ ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے۔

روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے۔ معاد ہے تو معاش بھی ہے،

دین ہے تو دنیا بھی ہے، اک گونہ بےخودی بھی ہے مگر اس کے

اندر خودی بھی کارفرما ہے۔ خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ

بندوں کے لئے محبت و شفقت بھی ہے۔ کڑا اجتماعی نظم بھی ہے تو

فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے گھری نہایت ہے تو دوسری طرف ہے گیر سیاست بھی ہے۔ قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ ازدواجی زندگی کا بکھیڑا بھی نہایت خوب صورتی سے چل رہا ہے۔ مظلوموں کی دادرسی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپ کی سیرت کی مدد سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم، ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر، ایک مزدور، ایک جج، ایک معلم، ایک واعظ، ایک لیڈر، ایک ریفارمر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی یکساں درس حکمت وعمل لے سکتا ہے۔ وہاں ایک باپ کے لئے ایک شوہر کے لئے ایک پڑوسی کے لئے یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درس گاہ تک آپہنچتا ہے۔ پھر اسے کسی دوسرے دروازے کو کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے۔

اسی لئے میں اس ہستی کو "انسان عظیم" کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسان اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوان حیات روشن کر سکتے ہیں۔ کروڑوں افرادِ انسانی نے اس سے روشنی لی۔ لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و عمل کے دیئے اسی کی لو سے جلائے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دیس دیس کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں۔ کوئی انسان نہیں جو اس "انسان اعظم" کا کسی نہ کسی پہلو سے زیر بار احسان نہ ہو لیکن اس کے احسان مند اس کے جانتے نہیں، اس سے تعارف نہیں رکھتے۔

اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی۔ لیکن وہ جماعت خود ہی اس سے اور اس کے پیغام سے دور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں لیکن اس کی

کھلی ہوئی کتاب عمل کے اوراق پر انسان اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اس جماعت اور قوم کی مذہبیت، اس کی سیاست، اس کی معاشرت، اس کے اخلاق، اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس سیرت کے بہت ہی دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چپے پر بھی یہ نہیں گواہی دیتا کہ میں محمدؐ کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات واقدار کا آئینہ دار ہوں، بلکہ الٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو کر اپنے سرمایۂ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ لیا اور انسان اعظم کی سیرت کا گلدستہ بنا کر طاق نسیاں پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی وقومی

جھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی
رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی ہستی کے پیغام
اور نمونۂ حیات کو گروہی اجارہ بنالیا۔ حالانکہ آپؐ ساری
انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لئے
پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت سیرت کو اس انداز سے پیش
کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے
میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے ابنائے نوع کی فلاح کا ذریعہ
بن سکتا ہے اور مسائل کے کھا کوں خارزاروں سے نجات پا کر
ایک پاکیزہ نظام زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضورؐ کا پیغام اور اسوہ
درحقیقت سورج کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں
کی طرح کا فیضان عام تھا۔ لیکن اسے ہم نے اپنی نا اہلی سے
گروہی خول میں بند کر دیا۔ آج افلاطون و سقراط، ڈاروِن،
میکیاویلی، مارکس، فرائڈ اور آئن سٹائن سے تو ہر ملک و مذہب
کے لوگ تھوڑا یا بہت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں

سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کارفرما نہیں ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور علم اور رہنمائی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمدؐ تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں لہٰذا مسلمانوں کے ہادی اور رہبر سے ہمارا کیا واسطہ! افسوس ہے کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جا پہنچنے میں ہمارے اپنے طرزِ عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خود ہم ہیں کہ جنہوں نے محسنؐ انسانیت کی نہایت غلط نمائندگی کی ہے۔

پیامِ مغرب

سرورِ عالمؐ کی ہستی تاریخ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بعثت محمدی کے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی، جاگیردارانہ، بادشاہتی اور روایتی و

اوہامی دور تمدن پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ سامنے دیکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی، عوامی و جمہوری، عقلی و استدلالی، ترقیاتی و ایجادی دور تمدن کی پہلی شعاعوں کا قافلہ دور کے افق سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے اور اس دور عقل و ترقی کا افتتاح خود سرتاج انسانیت ہی کے ہاتھوں کرایا گیا اور آنے والے دور کے لئے ایسے اصول دنیا کو فراہم کر دیئے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھا دیا گیا جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضورؐ کے ذریعے ہی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے روح اور بدن، اخلاق اور مادیت، عقلیت اور جذبات، اعتقاد اور عمل خواہش اور فرض اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کر دیا گیا۔ آپؐ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی کرتی تھی اور دوسری طرف دنیا پر

حکمرانی کرتی تھی۔ ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی اور دوسری طرف مادہ پر کارفرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی۔ ایک طرف حق کے مقابلے میں انتہائی عاجزی سے سر جھکا دینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لئے جان و مال کی بازی لگا دینے والی تھی۔ ایک طرف اپنے آپ کو رضائے الٰہی کی تحویل میں دیئے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاق و چوبند تھی۔ یہ طاقت جونہی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم و حکمت کے فانوس روشن کر دیئے۔ اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیئے اور اس نے اداروں کی تنظیم کے لئے نئے نئے تجربات نہایت تیزی سے کر ڈالے اور اس کی ساری حرکت، اس کی ساری ترقیات، اس کے علوم اور ایجادات اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر

اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی ۔ محمدؐ اور اس کے پیغام اور

اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکیں ۔ وہ ہستی جس کا کارنامہ

مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو

جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی

ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح Reformation

کی تحریک کی ڈور ہلانے والا تھا ۔ اس کو یورپ کا روشن دماغ

انسان نہ دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا ۔ اس کے کئی اسباب ہیں اور

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر

کریں ۔

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپ کو

یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا ۔ دونوں مذہب

اس وقت فساد و انحطاط کے افسوسناک دور سے گذر رہے تھے ۔

ایمانی و اخلاقی روح سے خالی ایک رسمیاتی ڈھانچہ شان تقدس

کے ساتھ دونوں کے ہاں کھڑا تھا۔ دونوں گروہوں میں مذہبی
طبقات پیدا ہوچکے تھے اور انہوں نے کاروباری ذہن کے
ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع
لٹ چکی تھی۔ صرف باہر چمکدار سائن بورڈ آویزاں تھے۔
سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں
کو اس کے دائرے میں روک رکھنے پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح
اور آدمیت کا بھلا کسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان حالات میں بہ
حیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی
کہ انہوں نے محمد کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو
پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس
کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کرلئے۔
اس کی دعوت کا مقابلہ کیا، اس کی تحریک کے راستے میں روڑے
اٹکائے۔ اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں۔ اس کی
تعمیر کو ڈھا دینا چاہا اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے

ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھولیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا خیالات سے گدلا جکیا۔ اور یہی گدلا پانی بہہ کر بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی ردعمل آج تک ان کے خلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے۔

۲۔ اسلام سے قبل کی اسلامی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی امنگیں کام کرنے کے لئے بڑی وسیع جولان گاہ سامنے رکھتی تھیں۔ لیکن اسلام کے ابھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آ ابھری اور آہستہ آہستہ نشوونما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً

اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگیں کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے ردِ عمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا تاریخ کے میدان میں کھلے اور بدیہی اسباب کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس مین سپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چڑ پیدا کر لی۔ یہ کد اور چڑ بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ صلیبی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہاء تک جا پہنچا۔ اس دور تک آتے آتے چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لئے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے راہ رویاں اسلام اور سرورِ عالم ؐ کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرتِ محمدی ؐ کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

۴۔ اسلام اور عیسائیت کے اس لمبے دور کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لئے ہوئے تھے اور اسلام اسی گروہ کے طبقاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب ہوا تھا اس لئے اس گروہ نے محسنِ انسانیت اور اس کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے گلی گلی پھیلایا۔ قرنوں کے اس پروپیگنڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے اربابِ عقل تک جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں سے ذہنی سطح میں کچھ بھی بلند نہیں ہوتے چنانچہ اٹھا کے دیکھ لیجئے۔ مستشرقین کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے

بڑے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے کوئی ایک آدھ استثنائی مثال مل جانا اور چیز ہے یہاں تو اس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہل مغرب کے یہاں پایا جاتا ہے۔

۴۔ گذشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپیریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان قومیں اسلام سے انحراف، خدا سے بغاوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے گریز کی سزا پانے کے لئے ایک ایک کرکے مادہ پرست مغرب کے شہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں۔ مغرب کے شہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک تحت درجہ کی مزاحم روح کارفرما ملی اور یہ روح ہر جگہ مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے تصورات ابھارتا ہے جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپیریلزم کے خلاف جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام

کر رہی تھی۔ ہر جگہ دینی شخصیتیں رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظام اسلامی کے احیاء کے ولولے کارفرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آزادی میں دینی داعیہ پورے طور سے بروئے کار ملتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف ازسرنو ایک چڑ پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی اور بار بار ناقابل تسخیر ولولے ابھارتی تھی۔ چنانچہ اس چڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا اور ''ملا ازم'' کو ایک خوفناک ہوا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی روح دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے شکست کھانے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر ہر دیس میں اس کا مقابلہ کیا۔ تعلیم اور لٹریچر اور اثر اندازی کی پوری قوتیں صرف کر کے مغربی امپیریلزم نے برسوں میں جا کر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی اور

اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری، سیاسی، و تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اس پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھچاؤ بڑھتا ہی گیا۔

۵۔ مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو ان کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے پست ہے وہ اس سے نظریۂ زندگی اور نظام حیات کا درس لے سکیں اور اسے برپا کرنے والی ہستی کا احترام کر سکیں۔ پھر جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مرعوبیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کو اسلام کو مغربی نقطۂ نگاہ کے مطابق ڈھالتے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان نگاہوں میں اور کم ہو گئی۔ مسلمانوں

سے معذرت خواہانہ نقطہ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مغرب کے انسان کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آج مغرب محسن انسانیت کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطہ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مخالفانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے جس کی ساری تگ و دو لاشعوری محرکات کے ردعمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے۔ وہ تیغ خونخوار لئے جدھر بڑھتا ہے قتل عام کرتا چلا جاتا ہے اس پیکر رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کا مرتبہ دے دیا گیا ہے

اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریک اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں، اور یہودیوں سے مستعار لئے گئے تھے۔ ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اپنا کوئی جوہر قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض نمائش تھا، اور محض ڈرامائی تدابیر سے تسخیر عوام کر کے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہوگا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جا سکتا ہے جس کا تجربہ ہمیں سرور عالم کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحب دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کر کے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کئے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے نہج پر پڑ کر

جزئیاتی مسائل کی چند کونپلوں کو لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ داعی
اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز رکھا۔ مذہب کے لئے تلوار
اٹھائی۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور فلاں موقع پہ
یوں کیا اور فلاں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریق مطالعہ ہمیشہ
متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کے ذریعے
کسی نظام زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ اس کے
ذریعہ تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے اور
جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریۂ اساسی ہے کہ وہ کہاں تک
برحق ہے اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس
نظریہ ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پہ
زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں پھر ان اصولوں کے فریم
میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم
ہوتی ہے کہ نہیں! ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ
لے کر آتا ہے۔ آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے

جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں آپ کے

معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے

باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے

ہیں اور ہزار ہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص

انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے لاتا

ہے۔ آپ اس نقشے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک

لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ

لکیریں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے

کی مجموعی ترتیب کو ڈھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور

نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آجاتی۔ مغربی نظریات اور

نظاموں کو سمجھنے کے لئے تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لئے

جو انتہائی سائنٹیفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے وہی اسلام

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق

رکھ دیا جاتا ہے ایک بابِ غ پر رائے قائم کرنے کے لئے اس کو

مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے اندر کی
گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کونپلوں کو سارے

باغ سے الگ کر کے زیر مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ
سیرت محمدیؐ اور پیغام محمدیؐ کے پورے چمن کو دیکھیں اور اس کی
مجموعی ترتیب کو سمجھیں۔ پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ
اور ایک ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ اگر کسی نظام
یا نظریے یا تحریک یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے
ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خلاف ہوں تو
اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابل قدر چیز ہے ہی
نہیں اور وہ پورا مجموعہ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔ آخر آپ کا
ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی و تاریخی معیار نہیں ہے۔ ممکن ہے
بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ، تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیار
خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور سرے سے اس کے ناپنے کے
پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں..... لہٰذا سب سے پہلے تو معیار

اور پیمانوں کو بالمقابل رکھ کر جانچنا چاہئے اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت مشخص ہونی چاہئے۔

قرآن، اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو لٹریچر ارباب کلیسا اور مستشرق مورخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے میٹھے ڈنک سحر آگیں الفاظ کے پردوں میں رکھ دیئے ہیں کہ آدمی فریب نگارش کے اس اندراز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار درخشاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہے کہ جنھوں نے حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کو دلی اعتراف کے ساتھ بیان کیا ہے مگر خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں دی۔ مثلاً

حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے
"دربدح مسلمین" (Pro - Mohammaden) قرار دے
کر اس کی وقعت گھٹائی جارہی ہے۔ حیرت اس پہ ہے کہ مسلمان
مملکتوں سے آج مغرب کی ڈپلومیٹک اغراض وابستہ ہورہی
ہیں۔ ان کے تحت ان اقوام کی تالیف قلب کے لئے جانے کیا
کیا تدابیر اختیار کی جارہی ہیں لیکن کہیں اس ظلم کی تلافی کی فکر
نہیں کی گئی جو صدور عالم کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ ضمیر کی آواز کے خلاف محمد صلی اللہ
علیہ وسلم کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں۔ نہیں آپ
اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا
ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اپنے ہی بنائے
ہوئے اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ مروڑ کر
حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے ماخذ
سے روایات نہ لیں جو ایک طرف مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق

ناقابل اعتماد ہیں اور دوسری طرف جنہیں تاریخی تحقیق کے
مسلمہ معیارات قبول نہیں کر سکتے۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ
دلائل سے بات کریں، طنز و تعریض اور توہین و تذلیل کا غیر
شریفانہ ڈھب اختیار نہ کریں۔

☆ اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذباتی فضاء
پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضاء موجود رہی ہے۔ ہم چاہتے
ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے شرط اول یہ ہے
کہ مغرب اسلام، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے
نقطہ نظر کو صاف کر لے۔ ایک نئے ذہن کو ابھرنے کی
ضرورت ہے اور وہ نیا ذہن اس کلمہ سواء یا نقطہ اشتراک کو سمجھنے
سے پیدا ہو سکتا ہے جو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان
واقع ہے۔ ہمارا کلمہ سواء ذیل کے مشترکہ نکات سے بنتا ہے۔

عیسائی، یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں۔

تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے۔ تینوں کی عبادت کا طرز ملتا ہے۔ تینوں کے نزدیک بنیادی اخلاقی قدار یکساں ہیں

تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔

تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں:۔

مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی جو راہیں کھولی ہیں، مسلمانوں کا خالص مذہبی نقطہ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریات روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ (تھوڑی سی حدود کے ساتھ) دے سکتا ہے جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ

وسعت ظرف رکھتا ہے۔

جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی ہیئتیں استوار کی ہیں۔ پیروانِ اسلام کی فکر میں وہ پہلے سے شامل ہیں، بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے۔ نمائندگی و انتخاب، شورائیت، قانون کی عملداری، شہری حقوق اور ان میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے جامہ عمل پہنایا ہے۔ اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں!

عالمی کھچاؤ اور بحران کو پیشِ نظر رکھئے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لئے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے:۔

اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امنِ عالم کے

مسئلے میں جتنا تعاون مسلمان بہم پہنچا سکتے ہیں، اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی گروہ اعتقاداتی خوبیت انسانیت رکھتا ہے اور جہانی وحدت کے لئے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے، تو بین الاقوامی تصادموں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لئے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام سے وافر حد تک مل سکتا ہے۔

مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال یعنی سرمایہ پرستی اور کمیونزم دونوں کا مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہِ عدل پہ انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس کے پیروؤں ہی سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

غور و فکر کے لئے یہ مشترکہ نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہلِ مغرب اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے

میں اپنا نقطۂ نظر بدلیں۔ کیوں نہ وہ پادریوں اور مستشرقین کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات کو پارہ پارہ کر دیں۔ آج جبکہ ایک طرف مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے اور اب اس تجربہ کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ پھر یہ شاخسار حکمت اب نئی کونپلیں بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو مرکز امید بنا کر کچھ اور وقت گذارا جا سکے۔ دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک فرد کی زندگی کے ایک گوشے میں سکڑ کر رہنا پسند کرتا ہے۔ مگر آگے بڑھ کر زمام تمدن ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے کھڑے ہیں۔ لے دے کے ایک مرکز توجہ باقی ہے جہاں سے شعاع امید پھوٹتی ہے۔ اس کے لئے بھی اگر دلوں کے دروازے بند کر لئے جائیں تو آخر مریخ سے تو کوئی رہنمائی در آمد نہیں کی جا سکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاریخ

ساز، ایک محسنِ انسانیت، ایک قائدِ تمدن اور ایک انسانِ عظیم کی

حیثیت سے جانیں جو روشنی وہاں سے ملتی ہے، اس کے لئے دل

و دماغ کے دریچے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ

سائنٹفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہئے یہ کہ آپ

اسلام کو عیسائیت کے ایک حریف مذہب کی حیثیت سے نہ لیں

بلکہ جمہوریت، اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح

ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں،

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور اس نظام کے

موسس کی حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن

دورِ تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ

اس لحاظ سے جانچیں کہ وہ ایک جہانی ریاست چلانے کے لئے

آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونہ

انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جوہری دور کی

تہذیب کا کل پرزہ بننے کے لئے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جبکہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دور دور تک کوئی شرر بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا، پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھلملاتی دکھائی دیتی ہے جو گزشتہ پونے چودہ صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بناء پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ خوب سوچ لیجئے کہ حالات ہمارے سامنے کتنا خوفناک چیلنج لئے کھڑے ہیں اور آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی سکت موجود ہے؟

حق یہ ہے کہ اصل مجرم ہم خود ہیں اور ہم ہی محسنِ انسانیت کی شخصیت، پیغام اور کارنامے کو دنیا سے بھی اوجھل

رکھنے والے ہیں اور اپنی نگاہیوں سے بھی چھپانے والے ہیں۔

آج محسنِ انسانیت کی ہستی کا ازسرِ نو تعارف کرانے کی ضرورت ہے اور یہ خدمت شاید جوہری توانائی کے انکشاف سے بڑی خدمت ہوگی۔

یہ کتاب: سیرتِ پاک پر اعلیٰ درجہ کی علمی و تحقیقی کتابوں کے موجود ہوتے ہوئے میں نے اس کٹھن وادی میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس جذبے سے قدم رکھنے کی جسارت کی ہے کہ محسنِ انسانیت کی ہستی اس حیثیت سے ایک بار پھر بے نقاب ہو جائے کہ وہی زندگی کے شعور کا واحد سرچشمہ ہے۔ سیرت نگاری کے نہایت ہی قابلِ احترام شاہکار جو ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان میں پورا واقعاتی مواد ضرور موجود ہے لیکن قاری کہیں تو روایات کے اختلاف اور تحقیقی بحثوں میں کھو جاتا ہے۔ کہیں واقعات کے ربط و تسلسل کا سرِ رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ کہیں اس کے سامنے ایسے جزئیات آتے ہیں

کہ جس کی واضح معنویت اور قابلِ اطمینان توجیہہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔ کہیں علمی نکات اور تحقیقی مواد اور حوالوں کی کثرت اسے مرعوب کر دیتی ہے لیکن فقروں کے فقرے بھی اگر وہ پڑھ جاتا ہے تو اس کے باوجود وہ ایک تحریک کو اپنے سامنے موجزن نہیں دیکھتا۔ وہ کشمکش کے اس منظر کو دیکھ نہیں پاتا جو حضورؐ کی دعوت سے برپا ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو اس دور میں نہیں پاتا جس کی روحِ رواں نبی اکرمؐ کی ہستی تھی وہ مطالعہ کی وادیوں سے یہ احساس لے کر نہیں پلٹتا کہ میں بھی حضورؐ کی تحریک کا ایک موجہ بیتاب ہوں اور اپنے ماحول کی تیرگیوں کے خلاف دوجہد کرنے کا فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ مجھے بھی حضورؐ کے کلمہ حق کی مشعل کو فضاؤں میں بلند رکھنا ہے اور اس کی روشنی کو اتنا فروغ دینا ہے کہ تمدن کی دنیاؤں میں ایک صبح عالمتاب جلوہ فرما ہو جائے۔

یہی ایک پہلو ایسا ہے جس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے

پیدا چیز کی تصنیف کی کوشش کی گئی ہے۔

مطالعہ تاریخ کے لئے میں نے قرآنی زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک ہر چہار جانب پھیلی ہوئی دنیا حرکت اور گردش کی دنیا ہے۔ تغیر اور تنوع کی دنیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسابقت اور کشاکش اور جہاد اور معرکے کی دنیا ہے۔ اس میں کشش بھی کام کرتی ہے، مزاحمت بھی۔ اس میں عمل بھی پایا جاتا ہے۔ ردعمل بھی! اس میں تخریب بھی ہے، تعمیر بھی! اس میں روشنی اور ظلمت ایک دوسرے کے درپے ہیں! اس میں رات اور دن ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں! اس میں موت اور زندگی دست و گریباں ہیں! اس میں آگ اور پانی باہم دگر آویزاں ہیں! اس میں خزاں اور بہار ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے ہیں! غرض ہیکہ اس دنیا کے کسی بھی عالم اور کسی بھی گوشے پر نظر ڈالئے۔ اضداد کے جوڑے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر مصروف جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ اس کائنات

کے ایک حقیر سے مکانی گوشے میں انسانی زندگی کی سب سے زیادہ پرہنگامہ رزم گاہ واقع ہے ۔ ہمارا نظام تمدن و معاشرت ایک طوفانی سمندر ہے جس میں موجود سے موجیں، حبابوں سے حباب اور قطروں سے قطرے ہر ہر آن ٹکرا رہے ہیں ۔ یہاں حق اور باطل، خیر اور شر، سچ اور جھوٹ، انصاف اور ظلم اور نیکی اور گناہ کے درمیان از آدم تا ایں دم ایک معرکہ لڑا جا رہا ہے ۔ اس معرکہ کی باگ ڈور انسانی روح و نفس کے ہاتھ میں ہے جس کے سرچشموں سے گوناگوں خیال اور عقیدے اور نظریے پے بہ پے امنڈ رہے ہیں ۔ متنوع کردار نمودار ہو رہے ہیں اور متضاد فطرت کے اجتماعی نظام ظہور کر رہے ہیں ۔ ہر خیال، عقیدہ، نظریہ، کردار اور نظام اپنی ضد ایک ہمزاد کی طرح ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور ہر طاقت جو ابھرتی ہے ۔ اپنی حزب اختلاف کو جلو میں لے کے آتی ہے ۔ اس اختلاف و تضاد سے وہ ہر جہتی اور ہمہ گیر تصادم پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے ہماری ساری تاریخ

کو ایک داستانِ جہاد بنایا ہے اور آج یہ داستانِ جہاد ہمارے
لیے اپنے ہی خون کی روشنائی سے باب در باب اور فصل اور فصل لکھی
ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے!

☆ تمدنِ انسانی کی باہم ترکیب یافتہ دنیاؤں میں جو ہر
آئی اور ہر جہتی جہاد کہیں دلائل اور کہیں تلواروں سے کیا جا رہا
ہے۔ اس میں انسان کے دو ہی پارٹ رہے ہیں۔ ایک طرف
سے وہ شر و فساد کا علمبردار بن کے اٹھتا ہے۔ دوسری طرف وہ خیر
و فلاح کا داعی بن کر میدان میں اترتا ہے۔ کبھی وہ تخریب اور بگاڑ
کی قوتوں کا سرگرم آلۂ کار بنتا ہے۔ کبھی تعمیر اور بناؤ کے داعیات
پر لبیک کہتا ہوا سامنے آتا ہے انسانیت کے کچھ شیطانی پیکر وہ
ہیں جو زندگی کو دکھوں اور مصیبتوں سے بھر دینے کے لئے ایڑی
چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ پیکر وہ بھی
ہوتے ہیں جو امن و مسرت کی ایک ارضی جنت تعمیر کر دینے کے
لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات کھپا دیتے ہیں۔ معرکۂ حیات کے

کچھ جانباز وہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں بدی اور جھوٹ اور ظلم کا ہر طرف دور دورہ ہو جاتا ہے اور جہاد ہستی کے کچھ سپاہی وہ ہوتے ہیں جو نیکی اور سچائی اور انصاف کا سکہ چلا کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہی نیکی اور سچائی اور انصاف کے سپاہی ہیں جنہوں نے زندگی کو وہ کچھ دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ بسر کیے جانے کے کچھ قابل ہوئی ہے۔ تمدن میں آج جو جو پہلو بھی کسی قدر و قیمت سے مالا مال کھائی دیتے ہیں وہ انہی مایہ ناز ہستیوں کا فیضان ہے۔ انہوں نے انسان کے سامنے نمونہ کی زندگی پیش کی ہے۔ انھوں نے تمدن و معاشرت کا ایک معیار اور آئیڈیل ہمارے سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے ہمیں زریں اصول اور مقاصد دیئے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کی رگوں میں زندہ و پائیدار روایات کا خون دوڑا دیا ہے۔ انھوں نے اخلاقی اقدار کے تارے آسمان تہذیب پر جگمگا دیئے ہیں انھوں نے آدمی کو

حوصلے اور ارمان اور امیدیں اور ولولے دیئے ہیں۔ انھوں نے اصول و مقاصد کے لئے قربانی اور جدوجہد کا درس دیا ہے یہی ہستیاں ہیں جن کے روشن کارناموں کے طفیل تاریخ اس قابل ہوئی کہ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جایا اور اس قیامت تک نوع انسانی نت نئی روح عمل اخذ کرتی رہے۔

پھر جب کبھی بدی اور جھوٹ اور ظلم کی طاقتوں نے ایک سنگین نظام اور ایک آہنی ماحول بن کر زندگی کو خوب اچھی طرح گھیرا اور بھینچ لیا ہے اور آدمی ہمت ہار کر مایوسی کے گڑھوں میں جاگرا ہے تو ایسے موقعوں پر تاریخ کے یہی ہیرو نوع انسانی کے کام آئے ہیں اور انہوں ہی نے سوتوں کو جگایا۔ گرتوں کو اٹھایا۔ بزدلوں کو شجاعت کا آب حیات پلایا اور ہتھیار ڈال دینے والوں کو از سر نو میدان کارزار کی اگلی صفوں میں کھڑا کر کے شر و فساد کی قوتوں سے لڑ لیا۔ دوسرے لفظوں میں ان مایہ ناز ہستیوں نے تاریخ کے جمود کو توڑا۔ تمدن کے یخ بستہ سمندر میں پھر حرکت

پیدا کی۔ فکر و عمل کی رکی ہوئی ندیوں کو نئے سرے سے بہا دیا اور تغیر کی رو اٹھا کر سنگین نظام اور آہنی ماحول کو الٹ کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ کاروان انسانیت اپنے ارتقاء کے صراط مستقیم پر بے روک ٹوک رواں دواں ہو گیا۔!

خیر و فلاح اور تعمیر اور بناؤ کی مہم میں حصہ لینے والوں کی صفوں کا جب بھی جائزہ لیا جائے ان میں خدا کے انبیاء و رسل کی صف اول ہی اپنی امتیازی شان کی وجہ سے ہم سے بیش از بیش خراج عقیدت حاصل کرتی ہے۔ باقی جتنی بھی صفیں صدیقین اور شہداء اور صالحین کی آراستہ نظر آتی ہیں وہ سب کی سب اسی صف اول کے کارناموں کی خوشہ چین اور اسی کی کمانڈ میں کام کرنے والی ہیں اور انبیاء و رسل کی صف مقدس میں نگاہ بے اختیار جس ہستی پر سب سے پہلے جا رکتی ہے وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ یہ ہے تاریخ کا سب سے بڑا محسن انسانیت! اس ہستی کو جس پہلو سے دیکھیے اس کی کہانی

عظمتیں درخشاں نظر آتی ہیں اور ان عظمتوں کی قصیدہ خوانی

کرتے کرتے گذشتہ پونے چودہ صدیوں میں نہ جانے نسلاً بعد

نسل کتنے عقیدت مندان رسالت دنیا سے رخصت ہو گئے مگر

حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا! اور آئندہ بھی یہ حق کس سے ادا

ہوگا؟ محض ایک جذبہ شوق کا تقاضا ہے کہ جس سے پہلے بھی

سرشار رہے اور پچھلے بھی سرشار رہیں گے۔ جناب ماہر کی

انساہٹ سے اسی جذبہ شوق کے تحت راقم الحروف کے جی

میں آئی کہ آنحضور کی سیرت کے اس عظیم پہلو کو اجماً نمایاں کیا

جائے کہ آپ کا خیر مقدم کیا گیا اور کس طرح ساری عمر ایک بے

مثال محسنؐ کے احسان کا جواب اندھی مخالفتوں اور ذلیل قسم کی

شرارتوں سے دیا جاتا رہا اور دوسری طرف اس ظلم و تشدد اور ان

مخالفتوں اور ان شرارتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے رسول

پاکؐ نے کس سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا!...... حدیث دلبر کے

اس درد بھرے پہلو میں ان کے لئے بھی ایک سبق ہے جو نبیؐ کا

راج قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں اور ان کے لئے بھی ایک سبق ہے جو ایسی کسی جدوجہد کی مزاحمت کرنے کے لئے اٹھیں!

یہ ہے تاریخ انسانیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام! ......تاریخ گواہی دیتی ہے کہ وہ سب سے بڑا تاریخ ساز تھا۔

انسانی فلاح و بہبود کے سب سے بڑے اس کام کو کرنے کے لئے جب حضرت خاتم النبیین تشریف فرما ہوئے تو وہ ساری عقوبتیں اور ایذائیں جو جملہ انبیاء و رسل پر مختلف زمانوں میں آزمائی گئی تھیں۔ شیطان بیک دم ان سب کو جمع کر کے لایا اور ایک وتنہا یتیم نوجوان کو چومکھی لڑتے رہنے پر مجبور کر دیا! سیرت نبوی کا منظر کچھ ایسا ہے جیسے تاریکی کے طوفانی سمندر میں بغیر کشتی اور پتوار کے کوئی پیراک موجوں، گردابوں اور نہنگوں سے لڑ رہا ہو۔ زفیر بجاتی ہوئی تیز وتند

ہوائیں چل رہی ہوں، کالی گھٹاؤں کا غیظ و غضب برق و رعد کی

چمک اور کڑک بن کر ٹوٹ پڑتا ہو۔ اولوں کی بوچھاڑیں پڑ رہی

ہوں...... لیکن شناور پھر بھی اپنا راستہ نکالتا آگے ہی آگے بڑھتا

چلا جا رہا ہو! کیا تاریخ کے پاس ایسی رقت انگیز مظلومیت اور ایسے

عزم آموز استقلال کی کوئی مساویانہ مثال ہے؟

معرکہ خیر و شر کا ڈرامہ جب بھی اسٹیج ہوتا ہے اس کے

بنیادی کردار ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے۔

جغرافیائی ماحول نیا پیدا ہو جاتا ہے، اشخاص کے نام بدل جاتے

ہیں، لیکن ان کا مقررہ پارٹ نہیں بدلتا۔ ایک کردار صاحب

دعوت کا کردار ہوتا ہے۔ دوسرا کردار سوسائٹی کے اس جوہر خاص

کا ہوتا ہے جو سچائی اور نیکی کی پکار سنتے ہی، آواز کو اپنے فطری

ذوق سے پہچانتا اور اس پر بے دھڑک لبیک کہتا ہے اور سابقون

اولون کا موقف سنبھالتا ہے۔ تیسرا کردار اخلاق کے ساتھ

اختلاف کرنے والوں کا ہوتا ہے جو بات کو سنتے ہیں، سوچتے

ہیں مگر علم وشعور کی کوتاہی اور بعض ذہنی ونفسیاتی رکاوٹوں کی وجہ

سے حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں..... چوتھا

نہایت ہی سرگرم اور ہنگامہ آرا کردار دشمنان حق کا ہوتا ہے جو

اپنے مفاد اور اپنے مناصب اور اپنے مرتبے اور اپنی بگڑی ہوئی

عادات کی وجہ سے اول روز سے جانتے بوجھتے ضدم ضدا کے

اسلوب پر مخالفت کی مہم چلاتا ہے اور روز بروز اس رو میں بہکتا

ہی چلا جاتا ہے۔ پانچواں کردار کمزور عوام کا ہوتا ہے جو معاشرہ

کے اونچے طبقوں کے زبردست ہونے کی وجہ سے کوئی جرأت

مندانہ اور فعالانہ اقدام نہیں کرسکتے اور نہ ذہنی طور پر آسانی سے

کسی دعوت کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ

بالعموم داعی حق اور دشمنان حق کی کشمکش کو سالہا سال تک تذبذب

کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں اور جب آخر کار پانسہ کسی طرف پلٹ

جاتا ہے تو پھر یہ سیلاب قوت بھی حرکت میں آتا ہے اور اسی رخ

بہہ نکلتا ہے۔ پس معرکۂ خیر وشر کے ڈرامے کی گرماگرمی دو ہی

کرداروں کی مرہون منت ہوتی ہے! یعنی داعی حق اور اس کے رفقاء کا کردار اور جوابی اور منفی طوفان اٹھانے والے فعال مخالفین کا کردار! ناممکن ہے کہ دعوت حق کھیل کھیلا جائے اور یہ دونوں کردار آمنے سامنے نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ سچائی اور نیکی کی آواز اٹھایئے تو اس کے جواب میں جھوٹ اور بدی کی ساری طاقتیں امنڈ کر نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لئے کام شروع کیجئے تو دنیا گالیوں اور الزامات اور پروپیگنڈوں اور سازشوں اور تشدد کے مختلف ہتھیاروں کے ساتھ ہجوم کر کے نہ آجائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر محض کچھ اچھی باتیں سوچتے اور کہتے رہتے، اپنے پسندیدہ طریقے پر خدا کی رکوع و سجود کے ساتھ صرف عبادت کرتے رہتے، کسی خلوت میں بیٹھے ذکر اذکار فرماتے رہتے، بلکہ اچھے اچھے وعظ بھی فرماتے رہتے اور مریدوں کا ایک حلقہ یا اپنے متبعین کی ایک بے ضرر سی انجمن

بھی بناڈالتے تو زمانہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا۔ لیکن آپ ساری زندگی کو بدلنے چلے تھے۔ آپ تمدن کی ساری عمارت کی تعمیر نو چاہتے تھے۔ آپ نظام اجتماعی کو ادھیڑ کر بہترین نقشے پر ازسر نو بنانے پر مامور تھے۔ اپنے مفاد اور حقوق کے اس سارے توازن کو درہم برہم کر دینے کے درپے تھے جو آہنی مضبوطی کے ساتھ قائم تھا۔ آپؐ انسان کو ایک نئے اعتقادی و اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ پہلے دن سے آپؐ نے اسی چیز کی دعوت دی اور پہلے دن سے قوم نے آپؐ کی دعوت کا یہی مفہوم سمجھا۔ چنانچہ سارے کا سارا جوابی رویہ اسی مفہوم کے فطری ردعمل سے پیدا ہوا۔

لیکن اور سچائی کی ہمہ گیر تحریک کے مخالفین کا کسی بھی دور میں جائزہ لیجئے۔ تو دیکھئے گا کہ ان کے منفی ہنگاموں کی تدریج اور تکنیک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ سب سے پہلے ہمیشہ معمولی سی استہزا و تضحیک سے کام لیا گیا۔ پھر اگلے مرحلے میں

گالیوں اور طعنوں، جھوٹ، افتراء اور نکتہ آفرینیوں اور بدنام کن

الزامات کا طوفان اٹھایا گیا۔ پھر عوام میں غلط فہمیاں پھیلانے

کے لئے جھوٹے پروپیگنڈے کا زور باندھا گیا۔ معاملہ اور آگے

بڑھا تو ایک طرف قومی مفاد اور اتحاد کے خطرے میں پڑنے کا

واسطہ دلایا گیا۔ اور دوسری طرف مذہبی بنیادوں پر جاہل عامی

طبقے میں اشتعال پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ بیچ بیچ میں عقلی

دلائل سے تیر تکے لڑائے جاتے رہے۔ اعتراضات اور سوالات

کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ جب محسوس ہوا کہ ایک خطرناک دعوت

زور پکڑ رہی ہے تو سودے بازی کی کوششیں کی گئیں۔ سارے

حربے ناکام دیکھ کر تشدد کے نہایت ذلیل طریقے اختیار کئے

گئے اور معاشی اور سوشل بائیکاٹ کا دباؤ ڈالا گیا۔ قید و بند اور جلا

وطنی کے منصوبے عمل میں لائے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر داعیٔ

حق کے قتل کے ارادے کئے گئے۔ اگر معاملہ اس مرحلے سے

بھی آگے نکل گیا تو معرکہ کارزار گرم کرکے دعوت مبارزت دی

گئی۔ یہ سارے مراحل حضرت سیدنا خاتم المرسلینؐ کو یکے بعد بعد دیگرے پیش آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر مرحلے سے شاندار کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا اور وہ دن آیا کہ سارا عرب حضورؐ کے قدموں میں تھا۔

اس کتاب میں سیرت پاک کے مستند واقعاتی مواد کے پورے ربط و تسلسل کے ساتھ ایسے انداز سے لایا گیا ہے کہ اس عظیم معرکہ خیر و شر کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جسے تاریخ کا جمود توڑ کر حضورؐ نے آغاز فرمایا اور پھر عمر کی ایک ایک گھڑی اس میں کھپا دی۔ مجھے امید ہے کہ قاری اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ساڑھے تیرہ صدیوں کا فاصلہ عبور کر کے اپنے آپ کو محسنؐ انسانیت کے قریب محسوس کرے گا۔ اسے واقعات کی رو اپنے سامنے چلتی معلوم ہوگی، وہ تحریک اسلامی کی لہروں کو اپنے عالم تصور میں امنڈتے دیکھے گا وہ حق و باطل کی اس کشمکش کا غیر جانب دار تماشائی بن کے کنارے بیٹھا نہ رہ سکے گا بلکہ اس

کے اندر مثبت جذبے ابھریں گے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ تاریخ انسانی میں میرا حصہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے!

مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے عزیمت و استقلال کا درس حاصل کیا جا سکے گا اور مشکل ترین حالات میں ادائے فرض کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے اپنے سب سے بڑے محسن (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحیح قدر دانی میں پیدا ہوگی۔ ایک گہرا جذبۂ سپاس ابھرے گا۔ ایک وابستگی و عقیدت آپ کی ذات کے لئے پیدا ہوگی جو مطلوب دین ہے۔ یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ آج جس نورِ حق سے ہمارے سینے روشن ہیں، اس کو لانے والا کیسی کیسی آزمائشوں سے گزر کر کیسی کیسی مخالفتوں کا مقابلہ کر کے کیسے کیسے رہزنوں کے حملوں کی زد پر آ کر اور خون اور آنسوؤں کے کیسے کیسے سمندروں کو پار کر کے اسے ہم تک پہنچا سکا ہے۔ اس سے یہ شعور حاصل ہوگا کہ سچائی اور نیکی کے علمبرداروں کی راہ پر آشوب گھاٹیوں سے ہو کر نکلی ہے اور اس

راہ کو جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی مقبول بارگاہ اور یکتائے روز
گار ہستی کے لئے کانٹوں سے صاف کر کے پھولوں کے فرش
سے آراستہ نہیں کیا گیا تو اب اور کس کے لئے کوئی ایسا خفیہ
شارٹ کٹ نکال دیا جائے گا کہ آدمی اپنے گوشۂ عافیت سے
اٹھے تو بغیر پاؤں پر گرد پڑے سیدھا جنت میں جا پہنچے۔ سوانح
رسالتمآب کی دکھ بھری کہانی پڑھنے سے وہ سارے مغالطے اور
من گھڑت تصورات کافور ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے آدمی عافیت اور
خدا پرستی کو جمع کرکے اس چین سے پڑا رہتا ہے۔ ہمیں سیرت
نبوی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ سنگ میل کہیں دکھائی
نہیں دیتے، وہ نشانات راہ سامنے نہیں آتے۔ وہ موڑ اور نشیب
وفراز پیش نہیں آتے۔ وہ کانٹے اور پتھر راستے میں نہیں پڑتے،
وہ رہزن اور غول بیابانی حملہ آور نہیں ہوتے۔ وہ ٹھوکریں نہیں
لگتیں۔ وہ چرکے نہیں آتے، جن کے تذکرے سے قرآن کے
صفحات اور سیرت کے ابواب بھرے پڑے ہیں۔ تو ہمیں اپنی

سمت سفر پر، اپنی منزل مقصود پر، اپنی اختیار کردہ راہ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ "کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است"..... اس کے مطالعہ سے ہر مسلمان پیشتر سے خبردار رہ سکتا ہے کہ اس امت میں جب بھی کوئی شخص یا گروہ دعوت نبوی کو لے کر اٹھے گا اور اسی طریقے پر کام کرنا چاہے گا تو اس کے خلاف استہزاء و تحقیر و دشنام طرازی، الزام تراشی، نکتہ آفرینی، مذہبی اشتعال انگیزی، تکفیر و تفسیق، جھوٹے پروپیگنڈے، سازش اور شرارت، ظلم اور تشدد کے وہ سارے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے جو اس کام کے لئے مقدر ہیں۔ ان طوفانوں میں گھرے ہوئے کسی بھی دور میں اٹھنے والے داعی حق کو پہچاننا اور اس کی بات کو سمجھنا اور اس کی پکار پر لبیک کہنا صرف ایسے ہی لوگوں کے لئے آسان ہو سکتا ہے جو قرآن اور سیرت نبوی کے مطالعے سے معرکہ خیر و شر کے ڈرامے کے پیش آئند ہر ایکٹ اور منظر کا صحیح تصور پہلے سے رکھتے ہوں۔ ہر

مسلمان کو یہ جاننا چاہیے کہ باطل کی وہ طاقتیں جنہوں نے نبی اکرم جیسی بے داغ شخصیت کو نہ بخشا اور جنہوں نے بعد میں حضور کی پیروکار ہستیوں..... امام حسینؓ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو حنیفہؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ..... کو بخش کے نہ جانے دیا۔ وہ کسی اور کو کہاں اپنی کرم فرمائیوں سے مستثنیٰ رکھنے پر تیار ہو سکتی ہیں۔ سیرت نبوی ہمیں ہر دور میں داعیان حق اور دشمنان حق کے کردار میں تمیز سکھاتی ہے۔ میں نے ان سارے کرداروں کو اس کتاب میں نمایاں کر دینے کی کوشش کی ہے جو معرکہ خیر و شر میں کام کرتے ہیں!

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس خوفناک تضاد کا احساس دلائے گا جو ہمارے ایمان بالرسالت اور ہماری عملی زندگیوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ آج کوئی ایک سرزمین بھی ایسی نہیں ہے جہاں محسنؐ انسانیت کا نظام حیات برپا ہو کر کام کر رہا ہو۔ عالم اسلام بادشاہتوں اور آمریتوں کی جولانگاہ بنا ہوا ہے

جن کے دم سے ایک طرف قدیم ظلمتیں ہمارے گرد محیط ہیں اور دوسری طرف جدید دور کی تاریکیاں ہم پر مسلط ہیں۔ ذہنی لحاظ سے ہم جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ معاشی لحاظ سے مفلوک الحالی میں مبتلا ہیں۔ ثقافتی لحاظ سے دوسروں کے بھکاری ہیں اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم دونوں بلاکوں کے لئے سستا شکار ہیں۔ یہ ہے اس تضاد کی سزا جسے ہم بھگت رہے ہیں۔

اس کتاب کا اصل پیغام یہ ہے کہ ہم محسن انسانیت کی دعوت کا احیاء کریں..... حضورؐ کے قائم کردہ خطوط پر تبدیلیٔ احوال کے لئے جدوجہد کریں اور نظام عدل و رحمت کو ٹھیک اس عملی نقشہ پر استوار کریں جو قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس قائد انسانیت نے وضع کیا تھا! وقت آگیا ہے کہ ہم اور ہمارے نوجوان تہذیب حاضر کی مرعوبیت کا بوجھ سروں سے اتار پھینکیں، اور اس مادہ پرستانہ دور کے خلاف فکری بغاوت کا علم اٹھائیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو کتابوں کے صفحات

سے نکال کر تیئے سرے سے عملی زندگی کے اوراق پر رقم کریں۔

اسے ایک اجتماعی نظام کی صورت میں مرتب کر دیں اور راہ

نجات کھولنے والی وہ تیسری طاقت بنیں جس کی جگہ تاریخ میں

خالی پڑی ہے۔

خدائے رحیم اس ناچیز سعی کو قبول کرے اور اسے اپنے

مقاصد میں کامیاب کرے!

نعیم صدیقی

مورخہ یکم دسمبر 1959

....

محسن انسانیت

صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

تعارف

شخصیت

ایک نظر میں!

واذ انظرت الی اسرة وجھہ

برقت کبرق العارض المتھلل۔

......ابو کبیر ہذلی

جب میں نے اس کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی،

تو اس کی شان رخشندگی ایسی تھی جیسے کہ

کسی لکۂ ابر میں بجلی کوندرہی ہو! (رنگ تغزل سے مملو یہ شعر دورِ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر ہذلی کا کہا ہوا ہے، اور حضرت عائشہؓ نے بے تکلفی کے ایک موقع پر بڑے لطیف انداز سے حضورؐ کو اس کا مصداق ٹھہرایا)۔

"یہ چہرہ

ایک جھوٹے آدمی

کا چہرہ

نہیں

ہو سکتا"۔

......عبد اللہ بن سلام

ایک جھلک (دوسری کتابیں بھی سامنے ہیں لیکن اس موضوع کے لئے مؤلف زیادہ تر شمائل ترمذی کا منت کش رہا۔

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیاء) ہمیشہ غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی رہنمائی، تہذیبوں کی تعمیر نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے افکار سے متعلق ہے۔ سیرت پاک کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسن انسانیت کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضاء کا تناسب خاص، اس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس

پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے
اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی کے مقام کا تصور کر سکتے ہیں

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہی قسمت ہے کہ دنیا کے
سب سے بڑے انسان کا روئے زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے
اور نہ ہم عالم واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل
کر سکتے ہیں۔ ہم حضورؐ کے حسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک سکتے
ہیں وہ حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پا سکتے ہیں

حضورؐ کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصور موجود نہیں ہے۔ خود ہی
حضورؐ نے امت کو اس سے باز رکھا کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے
ورے ورے نہ رک سکتا۔ حضورؐ کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ
جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے
اور اس کے اعزاز کے لئے کیسی کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار
ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ

میں حضورؐ کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں۔ لیکن کونسا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضورؐ کے عالم خیال اور کردار کا گوشہ بہ گوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسم مبارک محمدؐ تھا۔ بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضورؐ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا، بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لئے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیاء اور صلحاء کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جائیں۔

لیکن حضورؐ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں

حضورؐ کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحاب روایت نے ہم نے پہنچا دیا ہے۔ یہاں ہم اس لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضورؐ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے۔.....ایک تعارف !!

حضورؐ کے چہرہ اقدس، قد و قامت، خد و خال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہے وہ بہر حال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت صبر و استقامت، راستی و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصاف حمیدہ کا جامع تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ کے جسمانی نقشے میں روح نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے اور آپ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبے کی ایک دلیل تھی۔ اس موقع پر آپ کا ایک ارشاد یاد آیا۔ فرمایا۔ وان تقوی اللہ تبیض الوجوہ خدا کا

تقویٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔ نبوت تو ایمان و تقویٰ کی

معراج ہے، نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتاب حق کی ایک جھلک!

وجاہت......

☆ میں نے جونہی حضورؐ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا''۔ (عبداللہ بن سلام)

ا۔ یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حصین تھا۔ سرور عالمؐ کے مدینہ آنے پر یہ دیکھنے کو گئے۔ دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا بعد میں اسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔ (سیرۃ المصطفیٰ۔ مولانا ادریس کاندھلوی جلد اول، صفحہ ۹۴۳،۵۴)

☆ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے

دکھایا کہ یہ ہیں خدا کے رسول!...... دیکھتے ہی میں نے کہا۔ واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں"۔ (ابو رمثہ تیمی)

۲۔ مدینے میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضورؐ کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا۔ ایک اونٹ کا سودا کرلیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوائے دیتا ہوں، بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی کہ بغیر پہچان کے معاملہ کرلیا۔ اس پر سردار قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا جو خود شریک قافلہ تھے۔ بعد میں حضورؐ نے طے شدہ قیمت سے زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوادیں (سیرت النبیؐ مولانا شبلی مرحوم، جلد دوم ۲۸۰۔ المواہب اللدنیہ ج ۲ ۲۲۲۔

☆ مطمئن رہو، میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمہارے

ساتھ بدمعاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کردوں گی"۔ (ایک معزز خاتون)

☆ "ہم نے ایسا خوب رو شخص اور نہیں دیکھا (اس پر خواتین حضورؐ کی خدمت میں ابو قرصافہ کے ساتھ بیعت اسلام کے لئے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے انہوں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ (المواہب اللدنیہ جلد اول ۵۵۴)...... ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے"۔ (ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)

☆ "حضورؐ سے زیادہ خوبرو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا، گویا آفتاب چمک رہا ہے"۔ (ابو ہریرہؓ)

☆ "اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے"۔ (ربیع بنت معوذؓ)

☆ ''دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا''۔

(حضرت علیؓ)

☆ ''میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا۔ آپؐ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کئے ہوئے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو۔ بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں''۔ (حضرت جابرؓ بن سمرہ)

☆ ''خوشی میں حضورؐ کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپؐ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے''۔

(کعبؓ بن مالک)

☆ ''چہرے پر چاند کی سی چمک تھی''۔ (ہندؓ بن ابی ہالہ)

چہرہ......

☆ ''بدر کی طرح گولائی لئے ہوئے''۔ (براءؓ بن عازب)

☆ ''چہرہ بالکل گول نہیں تھا۔ ہلکی گولائی لئے ہوئے''۔ (حضرت علیؓ)

☆ ''پیشانی کشادہ..... ابرو خم دار..... باریک اور گنجان..... دونوں جدا جدا، دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہو جاتا''۔ (ہندؓ بن ابی ہالہ)

☆ ''مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی''۔ (کعبؓ بن مالک)

رنگت......

☆ ''نہ چونے کی طرح سفیدی تھی نہ سانولہ پن......

گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی‘‘۔(حضرت انسؓ)

☆ ’’سفید سرخی مائل‘‘(حضرت علیؓ)

☆ ’’سفید مگر ملاحت دار‘‘(ابوالطفیل)

☆ ’’گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا‘‘۔

(حضرت ابوہریرہؓ)

آنکھیں......

آنکھیں سیاہ.....پلکیں دراز‘‘۔(حضرت علیؓ)

☆ ’’پتلیاں سیاہ.....نظریں نیچی......گوشہ چشم سے

دیکھنے کا حیادارانہ انداز‘‘۔(ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ’’سفید حصے میں سرخ ڈورے......آنکھوں کا خانہ

لمبا.....قدرتی سرمگیں‘‘۔(جابر بن سمرہؓ)

ناک......

☆ ''بلندی مائل......اس پر نورانی چمک......جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

رخسار......

☆ ''ہموار اور ہلکے...... نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

دہن......

☆ ''فراخ......!'' (جابر بن سمرہؓ)

☆ ''بااعتدال فراخ'' (ہند بن ابی ہالہؓ)

دندان مبارک......

باریک...... آبدار...... سامنے کے دانتوں میں

خوشنما رہتیں''۔ (حضرت ابن عباسؓ)

☆ ''تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی معلوم ہوتی''۔ (حضرت انسؓ)

ریش......

☆ ''بھرپور اور گنجان بال''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

گردن......

☆ ''پتلی، لمبی...... جیسے مورتی کی طرح خوبصورتی سے تراشی گئی ہو''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ''گردن کی رنگت چاندی جیسی اجلی اور خوشنما''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

سر مبارک......

☆ بڑا...... مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

بال......

☆ "قدرے خمدار"۔ (حضرت ابوہریرہؓ)

☆ "نہ بالکل سیدھے تنے ہوئے ...... نہ زیادہ پیچدار"۔ (قتادہؓ)

☆ "ہلکا خم لئے ہوئے"۔ (حضرت انسؓ)

☆ "گنجان ...... کبھی کبھی کانوں کی لو تک لمبے! کبھی شانوں تک"۔ (براء بن عازبؓ)

☆ "درمیان سے نکلی ہوئی مانگ"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ”بدن پر بال زیادہ نہ تھے..... سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر“۔ (حضرت علیؓ۔ ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ”کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصے سے تھوڑے سے بال تھے“۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ”کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصے پر تھوڑے سے بال تھے“۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

مجموعی ڈھانچہ......

☆ ”بدن گٹھا ہوا..... اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط“۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ”بدن موٹا نہیں تھا“۔ (حضرت علیؓ)

☆ ”قد..... نہ زیادہ لمبا تھا، نہ پست!..... میانہ“۔ (حضرت انسؓ)

☆ ''قامت مائل بہ درازی!...... مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا''۔ (براء بن عازبؓ)

☆ ''پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا''۔ (ام معبدؓ)

☆ ''دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضورؐ کا جسم (باوجود فقروفاقہ کے) زیادہ ترو تازہ اور توانا تھا'' (ا۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے عمرہ کیا تو سو اونٹ بہ نفسِ نفیس ہانکے اور ان میں سے ۶۳ کو بدست خود نحر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔)۔ (المواہب ج ا ص ۲۱۰)

☆ ''میں نے رسول اللہؐ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا'' (۲۔ مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضورؐ کی مخمہ واری میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لئے کوئی معیار صدق طلب کیا اس کے ذوق کے پیش نظر حضورؐ نے کشتی کرنا

پسند کرلیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپؐ نے اسے پچھاڑ لیا۔ اسی رکانہ پہلوان ان کے بیٹے ابو جعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں لی ہے اور ابو داؤد اور ترمذی نے اس پیش کیا اور بیہقی نے سعید بن جبیر کی دوسری روایت لی جس میں آتا ہے کہ حضورؐ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابو الاسود جمحی بھی ہے۔ (المواہب اللدنیہ ج ا ص ۴-۲۰۳))۔ (ابن عمرؓ)

کندھے اور سینہ......

☆ ''سینہ چوڑا...... سینہ اور پیٹ ہموار''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ''سینہ چوڑا''۔ (براء بن عازبؓ)

☆ ''مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ/براء بن عازبؓ)

☆ کندھوں کا درمیانی حصہ پر گوشت''۔ (حضرت علیؓ)

بازو اور ہاتھ......

☆ ''کلائیاں دراز...... ہتھیلیاں فراخ...... انگلیاں موزوں حد تک دراز''۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ ''ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں ہے جسے میں نے چھوا ہو اور وہ حضورؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو''۔ (حضرت انسؓ)

قدم......

☆ ''پنڈلیاں پر گوشت نہ تھیں...... ہلکی ہلکی سی ہوئی''۔ (جابر بن سمرہؓ)

☆ ''ہتھیلیاں اور پاؤں پر گوشت...... تلوے قدرے

ٹھہرے..... قدم چلتے کہ پانی نہ ٹھہرے"۔ (ہند بن ابی ہالہؓ)

☆ "ایڑیوں پہ گوشت بہت کم"۔ (جابر بن سمرہؓ)

ایک جامع لفظی تصویر:

یوں تو حضورؐ کے متعدد رفقاء نے حضورؐ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کئے ہیں لیکن ام معبدؓ نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وادی ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافر حق جب اپنی منزل اول (غار ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قوم خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضورؐ اور آپؐ کے ہمراہی پیاسے تھے۔ فیضان خاص تھا کہ مریل سی بھوکی بکری نے اس لحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضورؐ نے بھی پیا ہمراہیوں نے بھی، اور پھر کچھ بچ رہا۔ ام معبد کے شوہر نے گھر آکر دودھ دیکھا تو اچنبھے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ ام معبدؓ نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا

نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر ام معبدؓ نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ ام معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا، نہ کسی طرح کا تعصب بلکہ جو کچھ دیکھا اس وعن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا جو ترجمہ مؤلف ''رحمۃ للعالمین'' نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں:

''پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ پیٹ باہر نکلا ہوا، نہ سر کے بال گرے ہوئے، زیبا صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرمگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ، گویا دل بستگی لئے ہوئے، دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشی الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی، میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے، نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی،

نہ بندہ نہال کی تازہ شاخ، نہ بندہ منظر والا قد، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں۔ جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لئے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔!

لباس:

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضع قطع، قصر وطول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرمؐ کے لباس کے بارے میں حضورؐ کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضورؐ کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضورؐ نے لباس کے معاملے میں در حقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے:

یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباساً یواری سواتکم

وریشاً ولباس التقوی ذلک خیرہ! (اعراف۔ ۱۲)

اے اولاد آدم! ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس تمہارے لئے مقرر کیا ہے۔ اور لباس تقویٰ بہترین ہے......!

دوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقیکم الحر وسرابیل تقیکم بأسکم"...... (تمہیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لئے قمیصیں اور زرہیں فراہم کیں...... النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضورؐ کا لباس ساتر تھا۔ زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا۔ وہ چند کرئے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی اور ذوق سلیم کا ترجمان بھی۔ حضورؐ کو کبر وریا سے بعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا: انما انا عبد البس کما یلبس العبد۔ میں تو بس خدا کا

ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔ ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لئے آپؐ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوٰۃ) پیوند، قمیص اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامت کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا۔ اس لئے اس سے سخت تنفر تھا۔ دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص بہیئتوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضورؐ نے ممنوع ٹھہرایا ہے تاکہ امت میں اپنی خودی اور عزت نفس برقرار رہے، نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات وکردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔ چنانچہ حضورؐ نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن، آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، ثقافت ونفاست اور وقار کا حضورؐ کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضورؐ کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ

بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آیئے حضورؐ کے لباس پہ ایک نگاہ ڈالیں۔

کرتا (قمیص) بہت پسند تھا۔ کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کے لئے جو کرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینے پہ ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے۔ کرتا پہنتے ہوئے پہلے سیدھا ہاتھ ڈالتے پھر الٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے۔ (داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کا استعمال حضورؐ کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے)

عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے

کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں) اور وہ آپ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو ساتھ لئے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پہ پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لئے ایک خاص وزان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے تولو (اتزن وارجح) وزان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے توجہ دلائی الاتعرف نبیک؟...... تم اپنے نبیؐ پاک کو پہچانتے نہیں؟ وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپؐ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہر حال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا آپؐ اسے پہنیں گے؟ تعجب غالباً اس

بنا پر ہوا ہوگا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہل فارس کا لباس تھا اور تشبہ سے حضورؐ کا اجتناب معلوم تھا۔ (حالانکہ دوسرے تمدنوں کو اچھے اجزاء کو حضورؐ قبول فرماتے تھے۔) آپؐ نے جواب دیا: "ہاں پہنوں گا۔ سفر میں بھی حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں"۔ (المواہب اللدنیہ ج ا ص ۱۳۳)

سر پر عمامہ باندھنا پسند خاص تھا، نہ بہت بھاری ہوتا تھا نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے ۷ گز لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے۔ جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان رہتا۔ آخری پلو پیچھے کے رخ اڑس لیتے۔ تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ

ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ

لیتے۔ بدبنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے

لئے ایک خاص کپڑا (عربی نام ’’قناع‘‘) بالوں پہ استعمال

کرتے جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا

سلولائڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا

حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ

نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً میالا، خاکستری مائل

یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے اور فتح مکہ کے موقع پہ سیاہ

بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال

میں رہی اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بموجب عمامہ کے

ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا اور

اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے پہ امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر

میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی، سفر پہ نکلتے تو اٹھی

ہوئی باڑ دار ٹوپی استعمال فرماتے۔ سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔

اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی ۴/۱ ۲ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے۔ کبھی ایک پلو سیدھے بغل اور نکال کر الٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لئے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حبرہ کہا جاتا تھا، بہت پسند تھی۔ اس میں سرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے لئے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی۔ اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند

لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے، احتیاط گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع بیٹھنے کی وجہ سے (مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپؐ ہی نے مسلسل تربیت کر کر کے برسوں میں بلند کیا) کوئی جوں وغیرہ نہ آ گھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدباب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو" (۱۔ عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ (ترمذی) وعن ابی الاحوض عن ابیہ (نسائی))۔ سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیب بدن فرمایا۔ آپؐ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہاء پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جبہ بھی پہنا۔ (بخاری و مسلم) سرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیب بدن کیا۔ طیلسانی قسم کا کسروانی جبہ بھی کبھی پہنا (المواہب اللد

پہ) (۲۔ روایت، سماء بنت ابی بکر (مسلم))۔ جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قوم قرآنی کی کہ "پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا"۔ بس یہ ہے کہ معمول عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لئے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا۔ فرمایا۔ "حق یہ ہے کہ تمہارے لئے مسجدوں میں بھی اور قبروں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے"۔ (۳۔ ابو داؤد، ابن ماجہ)۔ فرمایا: "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مردوں کو کفن دو، کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں"۔ (۴۔ عن سمرہ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن اس شکل

میں کہ ہلکی دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سرخ رنگ

بہت ہی ناپسند تھا (لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض

صورتوں میں ممنوع فرمایا۔ (لیکن ہلکے سرخ رنگ کی دھاریوں

والے کپڑے آپؐ نے پہنے۔ ہلکا زرد (مٹیالا یا شتری) رنگ بھی

لباس میں دیکھا گیا۔

حضورؐ کا جوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپل یا

کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا۔ جس کے دو تسمے تھے۔ ایک انگوٹھے

اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا۔ دوسرا چھنگلیا اور اس کے

ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے

کے معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت

دو انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں

تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے

ہو کر پہنتے۔ کبھی بیٹھ کر بھی۔ پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے

پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے۔ ان کو آپؐ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی، جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا۔ کبھی حبشی پتھر کا۔ بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پتر یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپؐ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگوٹھی

میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کے بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے بنوائی تھی اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس استعمال ضروری تھی۔

وضع قطع اور آرائش:

حضورؐ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے۔ ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے، کنگھا کرتے۔ مانگ نکالتے۔ لبوں کے زائد بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ داڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے۔ اس معاملے میں رفقا کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی داڑھی کے زائد بال بہ نفس نفیس تراشے۔ فرمایا کہ جو

شخص سر یا داڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہئے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اکرمھا" (ان کو سنوار کے رکھو) (ا۔ روایت ابو ہریرہ (ابو داؤد)

یہ تاکیدیں حضورؐ نے اس لئے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً رنگ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ رہنا علومرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سدباب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رکھیں اور بستر کے قریب ۱۔ تیل کی شیشی ۲۔ کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی) ۳۔ سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی) ۴۔ قینچی ۵۔ مسواک ۶۔ آئینہ ۷۔ لکڑی کی ایک پتلی پچی۔

سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے آخر رات میں حاجات سے فارغ ہوکر وضو کرتے۔ لباس طلب کرتے اور خوشبو لگاتے۔ ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مشک اور عود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبو دار دھونی لیا کرتے، ایک عطردان تھا۔ جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ اپنے دست مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشہور بات ہے کہ آپ جس کوچے سے گذر جاتے تھے، دیر تک اس میں مہک رہتی تھی، اور فضائیں بتاتی تھیں کہ "گذر گیا ہے ادھر سے وہ کاروان بہار، خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے ماتحت آپ نے مردوں کے لئے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے

اور مہک چھپلے اور عورتوں کے لئے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو، مہک چھپی رہے۔

رفتار

حضورؐ کی چال عظمت، وقار، شرافت اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریقے سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا جھکا ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اتر رہے ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں "گویا زمین آپؐ کی رفتار کے ساتھ لپٹی جارہی ہے"۔ رفتار تیز ہوتی، قدم کھلے کھلے رکھتے۔ آپؐ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے"۔ حضورؐ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ "زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو"۔ (سورۂ لقمان)

تکلم

تکلم انسان کے ایمان، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجے کا اسلوب اور بیان کا زور، یہ ساری چیز واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضورؐ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت سے پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضورؐ کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپ تفکرات اور مسائل مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گذرتے، لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلتا ملتا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور

چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضورؐ کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری، ایک سلطنت کے مسائل، ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنہیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے، کبھی آپؐ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے"۔ (۱۔ شمائل ترمذی باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

لیکن آپؐ ایک داعی تھے، اور ایک تحریک کے سربراہ۔ اس لئے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لئے

لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لئے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہذا دوسری صورت حال حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں یوں رہتی کہ "جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر رہے ہوتے تو حضورؐ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے۔ جب ہم آخرت پہ گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی ہمارے ساتھ اس موضوع پہ تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے"۔ (۲۔شمائل ترمذی،باب ما جاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوگی۔ قرآن نے بھی وما ینطق عن الھوی کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ ام

معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ "گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی"...... الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ...... نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو۔ تاکید، تفہیم اور تسہیل حفظ کے لئے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے۔ مکروہ اور فحش اور غیر حیاء دارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن حارث کا بیان ہے کہ "میں نے حضورؐ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا"...... یہ مسکراہٹ حضورؐ کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی اور رفقاء کے لئے وجہ جاذبیت ہوتی۔ بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لئے ہاتھوں

اور انگلیوں کے اشارات (Gestures) سے بھی مدد لیتے۔
مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لئے شہادت کی انگلی
اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو
باہم دگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے۔
کسی شئے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں
لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو
سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں
ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے۔ کبھی سیدھے
ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے۔
کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے۔ کبھی ہاتھ کو ران
پر مارتے۔

......قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد
قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ
تو تھا ہی، وحی کی لسانِ مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا

تھا۔ حق ہے کہ حضورؐ افصح العرب تھے۔ حضورؐ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی۔ اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال نہیں کیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی، ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ایک قول (الحرب خدعة) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "هي لغة النبيؐ" یہ نبی اکرمؐ کی مخصوص زبان تھی، بے شمار اصطلاحات بنائیں۔ تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں خطابت کا نیا انداز نکلا اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو ترک کیا۔ ایک مرتبہ بنو نہد کے لوگ آئے تو اثنائے گفتگو میں آنے والوں نے تعجب سے کہا "اے اللہ کے نبیؐ ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ہی مقام پر پرورش پائی ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ آپؐ ایسی عربی میں بات کرتے

ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے"؟

فرمایا اور خوب فرمایا "ان اللہ عز و جل أدبنی فاحسن ادبی و نشات فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عز وجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنادیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے) ایک موقع پر کسی ملاقاتی نے کیا فرمایا؟ حضورؐ نے وضاحت کی۔ اس پر جناب صدیقؓ کہنے لگے "میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے۔ لیکن آپ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا"۔ یہاں بھی وہی بات حضورؐ فرماتے ہیں۔ "أدبنی ربی ونشات فی بنی سعد"

اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے۔ "اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں، حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے" فرمایا کانت لغب اسمعیل، قد درست فجاء نی بھا جبریل وحفظنیھا"

اسمٰعیل علیہ السلام کی زبان جو مٹ چکی تھی اسے جبریل مجھے تک لائے اور میرے ذہن نشین کردی۔(ا۔تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو:المواھب اللدنیہ ج ا۔ص ۱۵۴) مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان معمولی عربی نہ تھی، بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی۔جس کا جوڑ اسمٰعیلی زبان سے ملتا تھا اور جبرئیل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی پیغمبرانہ زبان تھی۔اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہئے کہ اکابر تاریخ خصوصا انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے،مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

حضورؐ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپؐ کو "جوامع الکلم" عطا کئے گئے تھے۔خود فرمایا کہ "اعطیت بجوامع

الکلم" (ا۔روایت ابوہریرہ (مسلم) جوامع الکلم حضورؐ کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالمؐ اپنی مثال آپ تھے۔آپؐ نے اسے خصوصی عطیات رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم مثالیں بیان کریں گے۔

(۱)"المرء مع من احب" آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

(۲)"اسلمہ تسلم" تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے۔(۲۔نامہ دعوت بنام ہرقل روم)

(۳)"انما الاعمال بالنیات" اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

(۴)"لیس للعامل من عملہ الاما نواہ" کسی

عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

(۵)"الولد للفراش وللعاهر الحجر" بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے۔ اور زانی کے لئے پتھر!

(۶)"الحرب خدعة" جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

(۷)"لیس الخبر کالمعاینة" شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

(۸)"المجالس بالامانة" مجالس کے لئے امانت (رازداری) لازم ہے۔

(۹)"ترک الشر صدقة" برائے سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۰) "سید القوم خادمھم" قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

(۱۱) "کل ذی نعمۃ محسود" ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

(۱۲) "الکلمۃ الطیبۃ صدقۃ" حسن گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۳) "من لا یرحم، لا یرحم۔" جو (مخلوں پر) خصوصاً انسانوں پر، رحم نہیں کرتا اس پر (خدا کی بارگاہ سے) رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشادات رسالتمآب بلحاظ، بلحاظ اسلوب، بلحاظ روح بالعموم پہچانے جاتے ہیں، اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضورؐ کے جو ایسے کلام ہیں، وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آئندہ گٹھاؤ، ان میں معنی

گہرائی، دل پر اثر کرنے والی روح اخلاص کلام نبوی کے

امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ تین تین پارہ ہائے

فصاحت یہاں درج کئے جائیں۔

☆ ''میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا

ہوں۔ نظام اجتماعی کے لئے سمع وطاعت کی تاکید کرتا ہوں......

خواہ (اسے چلانے کے لئے) کوئی حبشی غلام ہی (برسر قیادت)

کیوں نہ ہو کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے

وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہوں گے۔ پس (ایسے

حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میری ہدایت

یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اس کو مضبوطی

سے تھامو، اسے دانتوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے

نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ نیا شگوفہ بدعت ہے

اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (مشکوۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب

والسنۃ)۔

☆عمرو بن عبسہ نے حضورؐ سے کچھ باتیں کیں۔ جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضورؐ نے دیئے۔ اس چھوٹے سے مکالمے کو ملاحظہ کیجئے:۔

"اس دعوت و تحریک کے کام میں (ابتداءً) کون کون آپ کے ساتھ تھا"؟

"ایک مرد آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلالؓ)"

"اسلام (کی اخلاقی حقیقت کیا ہے"؟...... پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا"۔

"ایمان کا جوہر کیا ہے"؟......"صبر اور سخاوت"۔

"کیا اسلام افضل (معیاری) ہے"؟

"اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی

زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں''۔

''کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے''؟

''جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے''۔

''کیسی نماز افضل (معیاری) ہے''؟

''جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے''۔

''کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے''؟

''ایسی کہ ہم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں''۔

''کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے''؟

''اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے''۔

کونسی گھڑی (عبادت کے لئے) سب سے بڑھ کر ہے؟"

رات کا پچھلا پہر"۔ (۱۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان)

☆ ایک بار دریافت کیا گیا کہ "انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں"؟ فرمایا "الفم والفرج" (۲۔ روایت ابو ہریرہؓ۔ ترمذی) یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے، کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرمگاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا، روزی کا ناپاک ہونا اور جنسی جذبات کا بے راہرو ہونا، انسانوں کو عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور ظلم بھی انہی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

☆ حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپؐ اپنے

مسلک کی وضاحت کریں۔ آپؑ نے مختصراً جس فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرزِ فکر، اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"المعرفة رأس مالي، والعقل اصل ديني، والحب اساسي، والشوق مركبي وذكر الله انيسي، والثقة كنزي، والحزن رفيقي، والعلم سلاحي، والصبر ردائي، والرضاء غنيمتي، والعجز فخري، والزهد حرفتي، واليقين، قوتي، والصدق شفيعي، والطاعة حبسي، والجهاد خلقي وقرة عيني في الصلوة"۔

ترجمہ: عرفان میرا سرمایہ ہے۔ عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حزن میرا رفیق ہے، علم میرا

ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لئے وجہ اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے (لفظاً قوت ہو تو غذا ہے) صدق میرا سفارشی ہے، طاعت میرا بچاؤ ہے۔ جہاد میرا کردار ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"۔

☆ حسن تمثیل کی بے شمار زریں مثالیں آپؐ کے کلام میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپؐ نے بدوؤں کے ذہن نشین کرا دیئے۔ ان میں سے یہاں ایک ہی کو لیجئے۔

"مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر موسلا دھار بارش ہو پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پوری طرح جذب کیا اور مرجھایا ہوا سبزہ اس سے ترو تازہ ہو گیا اور نئی

بوٹیاں کثرت سے اُگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصہ ایسا
بھی تھا جس نے پانی کو اپنے اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے
لوگوں کے لئے مفید بنایا۔ انہوں نے اس کو پیا پلایا اور کھیتوں کو
اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسا جو چٹیل
میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا، نہ جذب کر کے
روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے
جنہوں نے علم دین میں سوجھ بوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے
دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے اسے فائدہ پہنچا۔ اس
نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دوسری مثال ان
لوگوں کی ہے جنہوں نے اس دعوت کو سن کر سر نہیں اٹھایا اور نہ
اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے''۔

......آپؐ کے اندازِ گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جا سکتا
ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ قولو اللناس حسنا۔ لوگوں
کو حسن تکلم سے خطاب کرو۔ آپؐ کا حسن کلام سادگی کی شان

لئے ہوئے تھا۔ بناوٹی کلام سے آپ کو بعد تھا۔ فرمایا:

"ابعدکم منی یوم القیمة الثرثارون المتشدقون و المتفیھقون"۔

تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔

اسی طرح آپ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ حضورؐ کے چمن زار تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لعابی دکھائی دیتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ روئی سے آپؐ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا۔ باوجود کہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب اور ہر آن کی پریشانیوں کے خارزار در پیش تھے۔

خطابت

تکلم عربی کا ایک اہم جزو خطابت ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے اور اس کے لئے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یوں بھی عربوں کی دولت تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضورؐ بہت بلند رہے۔ فریضۂ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا۔ آپؐ کی زبان کبھی نسیم سحر کی طرح، کبھی آب جو کی طرح اور کبھی تیغ برق دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپؐ نے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوت خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطاب فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدان جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسب ضرورت حرکت

دیتے۔ تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہ۔ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے محمد کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے، لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسان اعظم کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حنین وطائف کے معرکہ کے بعد حضورؐ نے مال غنیمت تقسیم کیا۔ تو مؤلفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نومسلم رؤسائے مکہ کو اس میں سے بہت سا حصہ دیا تا کہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہو جائیں۔ انصار کے کچھ لوگوں نے عجیب سے احساسات کی رو دوڑا دی، کہا گیا کہ:۔

"رسول اللہؐ نے قریش کو خوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون کی بوندیں

ٹپک رہی ہیں"۔

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصل غنیمت دوسرے لوگ لے جاتے ہیں"۔

یہ چرچے حضورؐ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ جواب ملا کہ "آپؐ نے جو سنا وہ صحیح ہے۔ مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کہیں۔ کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں۔ واقعہ کی تحقیق کے بعد آپؐ نے یہ تقریر کی:۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ پہلے تم لوگ گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پہ

انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے)۔

.....نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی، تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ، اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ'' ۔ (۱۔ بخاری جلد دوم، ص ۶۲۰)

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھئے، تجر خطابت کی اس دھار کو دیکھئے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی، پھر اس کی روانی دیکھئے، مطالب کے موڑ دیکھئے۔ پھر یہ غور کیجئے کہ کس طرح خطیبؐ نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پوری طرح

ابھاردی۔ انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں"۔

ابتدائی دورِ دعوت میں کوہ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ان الرائد لا یکذب اھلہ، واللہ لو کذبت الناس جمیعا ما کذبتکم، ولو غررت الناس جمیعا ما غررتکم، واللہ الذی لآ الہ الاھو انی لرسول اللہ الیکم خاصة والی الناس کافة. واللہ لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون ولتحاسبن بما تعملون ولتجزون بالاحسان احسانا وبالسوٓء اوانھا الجنة ابدا اوالنار ابدا"۔ (۱۔ جمہرۃ الخطب، ص ۵)

ترجمہ: قافلے کا دیاباں اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع

نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرض محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا اور اگر (بفرض محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ چار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں میں تمہاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور پر خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تم کو لازماً تمہارے کاموں کا حساب لیا جاتا ہے اور تمہیں بھلے کا بدلہ بھلا اور برے کا بدلہ برا ضرور ملتا ہے پھر یا تو ہمیشہ کے لئے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لئے دوزخ''۔

کیا ہی سادہ انداز بیان ہے، کتنا عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

حضورؐ کے معرکتہ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان، اخلاق اور اقتدار ارجمندوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطۂ عام کے لئے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکی مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور بچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لئے ایک عالم بالا بنا لیتے ہیں۔ مگر حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور

نجی تعلق رکھتے تھے۔ علیحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا۔ درحقیقت آپؐ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی، یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے سے کے آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق کو پہچانیں۔ بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے۔ اس میں "کسے رباکسے کار سے بنا شد" کی فضاء بڑی انسانیت کش ہو گئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اس فضاء کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم حضورؐ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستے میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ ہی سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جدا جدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گذرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی

جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لئے کھڑے ہوں۔ مجلس کے کنارے میں بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا: "اجلس کما یجلس العبد" اسی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں جس طرح خدا کا ایک بندہ اٹھتا بیٹھتا ہے...... (روایت عائشہؓ) اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے۔ کوئی آتا تو اعزاز کے لئے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ

جو سلسلہ کلام چل رہا ہوتا اس میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نماز

صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہؓ سے خوب باتیں ہوتیں۔

جاہلیت کے قصے چھڑ جاتے اور ان پر خوب ہنسی بھی ہوتی۔

(ا۔ روایت جابرؓ بن سمرہ، مسلم) صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس

موضوع سے اہل مجلس کے چہروں سے اکتانے کا اثر محسوس ہوتا

اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فرد مجلس پر توجہ فرماتے تا کہ کوئی یہ نہ

محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپؐ نے فوقیت دی ہے۔ دوران

تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے

گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ

ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک

رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی

سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پوری کر کے منہ نہ ہٹا لیتا آپ

برابر اپنا سر اسی کی طرف جھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ

کاٹتے۔ الا یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک

دیتے یا چہرے پر ناگواری آجاتی یا اٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا

کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے۔ ناپسندیدہ

باتوں سے یا تو اعراض فرماتے۔ ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ

یہ تھا کہ براہ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے۔ بلکہ عوام انداز میں

اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی

صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس

دلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ طریق اظہار تھا کہ یا تو شخص

متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدم التفات دکھاتے۔

ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔

چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپ بئس اخو العشیرہ یا بئس

ابن العشیرہ (اپنے گروہ کا برا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے

بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہ کو اس پر تعجب ہوا تو

آپ نے فرمایا: "وہ شخص ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ

شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں''۔ (۱۔المواہب اللدنیہ ج ۱ص ۲۹۱، بخاری)

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دینے اور اجازت لینے کے لئے تین مرتبہ سلام کہتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساس تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے: مسح اللہ عنک ماتکرہ (خدا تم سے ہر اس شے کو دور کرے جو تمہیں بری لگے) ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں

کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے: حسنة حسنة، ابل واخلق (یعنی خوب ہے خوب دیر تک پہنو، بوسیدہ کرو)۔ بد سلوکی کا بدلہ بد سلوکی سے نہ دیتے بلکہ عفوودرگذر سے کام لیتے۔ دوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے ساتھ اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے۔ کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا آدمی ہو یا رفقاء میں سے ہمیشہ "لبیک" (حاضر ہوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سرہانے بیٹھ کر پوچھتے "کیف تجدک"؟ (تمہاری طبیعت کیسی ہے؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر۔ کھانے کو پوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلی دیتے اور فرماتے: "لا باس! انشاء الله طهور" (فکر کی کوئی بات نہیں خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفاء کے لئے دعا

فرماتے۔ حضرت سعد کے لئے تین بار دعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پرسی بھی کی۔ ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لئے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لئے ہوئے پیدل خاصی دوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہوئی تھی) حضرت جابرؓ بیہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے دیکھا پھر وضو کیا۔ پانی کے چھینٹے دیئے۔ دعاء کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے،

عالم نزع میں بلالیا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ

الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار

فرماتے، صبر کی نصیحت کرتے اور چلانے اور پکا کرنے سے

روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور

تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ چلتے

مسلمانوں کو جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لئے دعا

کرتے۔ کوئی جنازہ گذرتا تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو...... کھڑے

ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں

کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا...... (ملاحظہ ہو زاد المعاد جلد ا،

ص ۱۴۵) تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لئے

دوسرے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسم مسلط ہے

کہ میت والے گھر میں دوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا

کہ باقاعدہ مجلس تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی

روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے۔ بعض اوقات پیشانی چوم لیتے۔ کسی کو سفر کے لئے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے جیسے یا ابوہریرہ کے بجائے "ابا ہر" حضرت عائشہؓ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پیار کرتے، دعا فرماتے، ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لئے عجیب سے کلمے کہتے یعنی خرقة خرقة فی هين كل بقه۔ (بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے "ہر مچھر کی آنکھ میں ہڈی کا جزو ہے" مگر

بظاہر یہ ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر ملک میں بچوں کو بہلانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں) ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: انھم لمن ریحان اللہ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے۔ بچوں کو قطار میں جمع کرکے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھو لیتا ہے۔ بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا، کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا: "یا ذا الاذنین!" (آؤ، دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابو عمیر کا پالا ہوا ممولا مر گیا تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضورؐ آئے تو پکار کر کہا: "یا ابا عمیر! ما فعل النغیر!" (ابو عمیر! تمہارے ممولے کو کیا ہوا؟) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحبزادے میاں راستے میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبداللہ کا کان پکڑ کر کہتے: "یا غدر! یا غدر!"

(اور دھوکے باز! اور دھوکے باز!) سفر سے آرہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے، بڑا ہوتا تو پیچھے، فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعاء برکت مانگ کر کم عمر کے بچے کو دے دیتے، آپؐ کے پیش نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریک اسلامی کی علمبردار ہوگی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ضعیف العمر والد کو (جو بینائی سے محروم ہو چکے تھے) بیعت اسلام کے لئے آپؐ کی خدمت میں لائے فرمایا: انہیں کیوں تکلیف دی۔ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروت کی انتہاء یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ آپؐ اس سے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو،

میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی اور اس کا کام کر کے دیا۔ (المواہب اللدنیہ، ج ۱، ص ۲۹۵) ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے بھی دیکھا تھا اور حضورؐ کی مروت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپؐ کے حسن کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپؐ نے کبھی اف تک نہ کی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا، نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا۔ اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپؐ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا''۔

اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام

لیا..... بجز اس کے کہ آپؐ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانون الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی

اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لئے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اتر جاتا ہے باہر دیکھئے تو بڑی آن بان ہے۔ گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضعد کھائی۔ گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضورؐ کو دیکھئے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ "رسول خدا

اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

آپ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے (کہ ان میں کوئی جوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو) بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے۔ (ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)۔نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے، بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالتے، کوئی خادم ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرا دیتے (مثلاً) اسے آٹا پسوا دیتے، کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے۔ (المواھب اللدنیہ، ج ا، ص ۲۹۳)۔ بازار جانے میں عار نہ تھی خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسول خدا جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں: "الین الناس

بسا ماضا حکا"۔ (سب سے زیادہ نرم خو، متبسم، خندہ جبیں!) اور اس لیعت کی شان یہ تھی کہ کسی خادم کو جھڑکا نہیں"۔ (المواھب اللدنیہ، ج ا ص ۲۹۳) "حق یہ ہے کہ رسول خدا سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل وعیال کے لئے شفیق نہ تھا"۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسولؐ خدا گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا۔ کچھ وقت اہل وعیال کے لئے تھا اور کچھ اپنے آرام کے لئے۔ پھر انہی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لئے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ آکر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات و حاجات لے کر آتے۔ (شمائل ترمذی۔ باب ماجاء في تواضع رسول الله صلى الله عليه

وسلم)۔ دیکھا جائے تو آرام کے لئے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

ازواج مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپ کو کرنا ہوتا پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپؐ کے ذمے تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقۂ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواج مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضاء کو آپ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔ گھر ایک انسانی گھر کی طرح تھا۔ جس کی فضاء میں فطری جذبات کا مدوجزر رہتا..... اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی اور تبسموں کی لعانی بھی۔ محبتیں بھی کارفرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضورؐ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب

شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی۔ کبھی کبھار قصہ کوئی بھی ہوتی۔ اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے۔ مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا۔ حضرت سودہ بھی موجود تھیں اور رسولؐ خدا دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہؓ سے کہا کہ کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمہیں ضرور کھانا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ ادھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہؓ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا، اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سودہؓ سے کہا کہ تم اس کے منہ پر ملو تاکہ حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ سودہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

حضور کر رہے تھے۔(المواھب اللدنیہ، ج ۱،ص ۲۹۶۔۲۹۷)۔

ایک موقع پر حضرت ابو بکرؓ آئے تو حضرت عائشؓ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا۔ غضب ناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اسی غصہ میں جناب صدیق چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے چٹکیلے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا۔ دیکھا! ہم نے تمہیں اس شخص سے کیسے بچا لیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصور سے فروتر پاتے ہیں اور خصوصاً نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پتلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش ...... حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا، اور اس میں سارے انسانی

جذبات کام کرتے تھے۔ مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پہ ہوتے تو اہل وعیال سے عام باتیں ہوتیں...... کبھی گھریلو امور پہ، کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پہ۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ کہانی بھی سناتے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے ام زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں ان میں سے ایک عورت ام زرع اپنے خاوند ابو زرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ خاتمے پہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمہارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابو زرع ام زرع کے لئے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے موقع پر کوئی قصہ سنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے)

حضورؐ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔ (شمائل ترمذی۔باب ماجاء في كلام رسول الله صلى الله عليه وسلم في السمر۔)

عمر بھی معمول رہا کہ رات کے دوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہوکر مسواک وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے۔ (زاد المعاد) قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہوجاتے۔ (شمائل ترمذی۔باب ماجاء في عبادة رسول الله صلى الله عليه وسلم۔) صحابہؓ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غفران خاص سے نوازا ہے..... (ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر) پھر اس قدر حضورؐ جان کیوں گھلاتے ہیں فرمایا: "افلا اكون عبداً شكوراً" کیا میں خدا کا احسان

شناس اور شکر گذار بندہ نہ ہوں۔ (شمائل ترمذی۔ ما جاء في عبادۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔)

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گذاری جائے جیسے مسافر گذارتا ہے۔ فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو نصب العین بنائیں اور دنیوی زندگی کو ادائے قرض یا امتحان کے طور پر گذاریں اور جنہیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لئے جدوجہد کرنی ہو۔ ان کے لئے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجے کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں اور پھر ان میں مگن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجے کی عمارتیں بنائیں اور نہ ان میں اسباب جمع کئے اور نہ ان کی زینت و آرائش کی۔ ان کے گھر بس بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں۔ (زاد المعاد في تدبيره

لامر المسکن. ج ۳،ص ۱۴۲) ان میں گرمی سردی سے بچنے کا

اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ

داری (Privacy) کا بندوبست تھے اور حفظان صحت کے

ضروری پہلو ملحوظ تھے۔(زاد المعاد فی تدبیرہ

لامر المسکن. ج ۳،ص ۱۴۲)

سازو سامان میں چند برتن بہایت سادہ قسم کے تھے۔

مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا۔ جس پر لوہے کے پتر لگے

تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک

کا سامان جمع تو کیا ہوتا ۔ روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ

ہوا۔ بستر چمڑے کے گدے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کی چھال

بھری ہوئی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے ٹاٹ کا بستر بھی

استعمال میں رہا جو دوہرا کر کے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کر

کے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ

مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ

بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعودؓ) رو دیئے۔ (ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ما جاء في فراش رسول الله صلى الله عليه وسلم)

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لایئے۔ واقعہ ایلاء کے زمانے میں انہوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ: آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے''۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے''۔ فرمایا: ''عمر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ لوگ دنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے''۔ (المواهب اللدنيه ج ا

ص ۲۰۴ نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امرأته، روایت عبد اللہ ابن عباس)۔

اکل و شرب

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا، گوشت سے خاص رغبت تھی۔ زیادہ ترجیح دست، گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے۔ نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی۔ ثرید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمایا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خربوزہ، ککڑی، لوکی، کھچڑی، مکھن وغیرہ اشیا شامل تھیں۔ دودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (تہ دیگی) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر اور میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر جو کے ستو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے

ستو پیش کئے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ امراء کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسایہ کے لئے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطور خاص دو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ، پانی ملا دودھ (جسے کچی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے غیر نشہ دار نبیذ بھی قرین ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھی استعمال کرتے لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا۔ لہذا اپھنکوا دیتے۔ بہ روایت ابو مالک اشعری یہ فرمایا بھی کہ میری امت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام دل کر کچھ اور رکھ دیں گے (چنانچہ سلاطین مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا)

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا۔ اکٹھے ہو کر

کھانے کی تلقین فرمائی۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شان فقر کے خلاف سمجھتے۔ اسی طرح دستر خوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلاف مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرمادیا تھا۔ کانچ، مٹی، تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دستر خوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلاف معمول تھا۔ دوزانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے۔ کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے مگر یہ پر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا۔ (روایت عمر بن امیہ، بخاری و مسلم۔ نیز روایت عائشہؓ، ابوداؤد و بیہقی)۔ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو تھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار

میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ وہ پھل اکٹھے بھی کھائے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی اُلٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی وار سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے تو جاتے مگر صاحب خانہ سے اس کے لئے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ تقاضائے مروت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپ بھی اٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے، دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لئے ادائے شکر کے کلمات ہوتے، نیز طلب رزق فرماتے اور صاحب خانہ کے لئے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔

پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت
آپؐ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور
بالعموم تین بار پیالہ منھ سے الگ کرکے سانس لیتے اور ہر بار
آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمد اللہ والشکر
للہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی
کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم
دائیں جانب سے دور چلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا دوسرا
وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے۔ مگر
داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بناء پر ان سے اجازت
لے کر ہی ترتیب توڑتے۔ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب
سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے"۔
کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سونگھنا ناپسند تھا۔
سانس میں بو کا ہونا چونکہ خلاف مزاج تھا اس لئے کبھی پیاز اور
لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو

ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے

پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد

معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک

آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے۔ (ملاحظہ ہو شمائل ترمذی (ابواب

متعلقہ)

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دوسری طرف اکثر

اوقات فقروفاقہ کا عالم درپیش رہا۔ جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ

دیں گے۔ فرمایا: "کل کما یاکل العبد" میرا کھانا پینا ایسا

ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے۔

نشست و برخاست

کبھی اکڑوں بیٹھتے، کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد

حلقہ زن کر لیتے۔ کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ)

لپیٹ لیتے بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم الٹے ہاتھ پہ تکیہ

سوتے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کرید دیتے۔ سونے کے لئے سیدھی کروٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔ کبھی چت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اوندھے لیٹنا سخت ناپسند تھا اور اسے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا ہو۔ کھلی چھت پر جس کے پردے کی دیوار نہ ہو، سونا اچھا نہ سمجھتے۔ وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سورتیں (سورۂ اخلاص اور معوذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔ (مختلف اذکار و ادعیہ کو ہم دوسرے موقع پر لائیں گے)۔ سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خراٹے لیتے۔ رات میں قضائے حاجت کے لئے اٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے۔ (شمائل ترمذی) سونے کے لئے ایک تہبند علیحدہ تھا، کرتا اتار کر تانگ دیتے۔

بشری حاجات

ضرورت کے لئے چونکہ اس دور میں گھروں میں بیت الخلا نہ تھے۔ اس لئے حضورؐ جنگل جاتے۔ عموماً اتنی دور تک جاتے (۲،۲ میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اڑیں موقع حاجت پر پہلے بایاں قدم رکھتے پھر دایاں۔ بیٹھتے ہوئے زمین کے بالکل قریب ہوکر مقام ستر سے کپڑا کھولتے۔ کسی ٹیلے وغیرہ کی آڑ ضرور لیتے۔ ضرورت کے لئے ہمیشہ جوتا پہن کر اور سر ڈھک کر نکلتے۔ قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے سے اجتناب تھا۔ رفع حاجت کے وقت انگوٹھی الگ کر دیتے۔ (واضح رہے کہ اس پر خدا اور رسولؐ کے اسماء کندہ تھے) آبدست بالالتزام بائیں ہاتھ ہی سے کرتے۔ جائے ضرورت سے الگ ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اٹھاتے پھر بایاں۔

غسل کے لئے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تہہ بند باندھ لیتے۔

سفر

سفر کے لئے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے۔ پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمول رہا۔ سفر میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں (Camp Life) ضرور حصہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی۔ سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کئے۔ آپؐ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لئے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں۔ (المواھب اللدنیہ ج ا ص ۴۹۲)۔ سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر سے رات میں واپس آنا

پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضورؐ میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پہ کارفرما تھے۔ آپؐ بہت صاحب احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضورؐ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے لئے سنگ دل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پر ہنگامہ ہوتی ہے۔ گھر کی پھیکی اور بدمزہ۔ آپؐ کو ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے اور

جہاں وہ منھ لگاتیں وہیں منھ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ حبشیوں کے ورزشی کرتب اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی آپ ؐ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پوچھتے کہ "کیا تم سیر ہو گئی ہو"؟ وہ کہتیں "ابھی نہیں!" دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ (المواہب اللدنیہ ج ا ص ۲۹۶)۔ حضرت صفیہ کو اونٹ پر سفر کرانے کے لئے آپ ؐ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجناب اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہ دونوں گر پڑے۔ ابو طلحہ ساتھ تھے۔ دوڑے ہوئے آپ ؐ کے پاس آئے۔ آپ ؐ نے فرمایا۔ پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے اونٹوں کو تیز چلایا۔ تو فرمانے لگے: "دیکھو! آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے"۔ (مسلم و بخاری) اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی۔ جس پر عتاب آیا کہ حلال شے کو حرام نہ کرو۔ (مغربی اہل قلم نے حضورؐ کی اس

صاف ستھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور ذمہ دار ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکاکت تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انہیں نفسانیت گھناونی پستیوں میں گراتی رہتی ہے۔ حضور کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرہ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگ پاکیزگی نمایاں تھا۔ آپ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حدود میں رکھ کر باحسن طریقہ پورا کیا اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا)۔

اپنے بچوں کے لئے بھی حضور کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیم کو رضاعت کے لئے ایک لوہار کے گھر میں مدینے کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا۔ ان کو دیکھنے کے لئے خاصا فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دھواں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔

(بہ روایت انسؓ)۔

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ ان کے صاحبزادوں امام حسنؓ و امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے۔ ان کو کندھوں پر سوار کرتے۔ ان کے لئے گھوڑا بنتے۔ حالت نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے۔ ایک بار اقرع بن حابس نے آپ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔ مگر آپ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اور پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ابنی ابراہیم صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپ کی موجودگی میں ہوئی۔ ام ایمن (کنیز) چلا چلا کر رونے

لگیں۔ حضورؐ نے منع فرمایا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ آپؐ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی ام کلثومؓ کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ (شمائل ترمذی۔ باب ماجاء في بكاء رسول الله صلى الله عليه وسلم) اپنے رونے کی کیفیت کو خود یوں بیان فرمایا: ''آنکھیں اشک آلود ہیں، دل غم زدہ ہے، مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا، کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے''۔ غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے: حسبي الله ونعم الوكيل۔ رونے میں اونچی آواز نہ نکلتی۔ بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے اور ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دلِ حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن وردِ زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بھی بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورۂ نساء کی اس آیت پر پہنچے "فکیف اذا جئنا ......" (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کر کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا کر لائیں گے) تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ (المواہب للدنیہ، ج ا، ص ۲۹۷)۔

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذبات ہمدردی و شفقت کا جو حضورؐ کو ساری انسانیت سے تھی اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے حیرت ہے کہ اس نزاکتِ احساس کے ساتھ حضورؐ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

ذوقِ مزاح

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسولِ خدا خندہ روئی کی صفت سے متصف تھے بلکہ فرمایا: وتبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ (تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کارِ خیر ہے) آپ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے کہ کان بسّاماً ضاحکاً۔ عظیم کارنامے انجام دینے والے شخصیت کے لئے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ "قد کان یباسط اصحابہ بما یولج حبہ فی القلوب" یعنی آپ ایسے بے تکلفانہ انداز مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقاء کے دلوں میں آپ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپ ہنسی، دل لگی کی باتیں کرتے اور مجلس میں شگفتگی کی فضاء پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا

اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کوئی بات شامل ہوتی ۔ نہ کسی کی دل آزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا ۔ غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے، حلق نظر نہ آتا ۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ " آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں "؟ ارشاد فرمایا " ہاں ! مگر میں خلاف حق کوئی بات نہیں کہتا " ۔

یہاں ہم حضورؐ پاک کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں ۔

...... کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا ۔ فرمایا : ہم تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے ۔ سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا ۔ فرمایا : ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہوتا ہے ۔

...... ایک بڑھیا نے آکر عرض کی کہ میرے لئے دعاء کیجئے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضورؐ نے مزاحاً کہا: اے ام فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی"۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا، اس سے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے اس بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جانے کا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ انا انشانا ھن انشآءً فجعلنا ھن ابکارا عربا اترابا۔ مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

...... زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپؐ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضورؐ کے کام کر لاتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جس کی قیمت حضورؐ باصرار ادا فرماتے) چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا

کچھ سودا بیچ رہے تھے۔ حضورؐ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے۔ پھر جب معلوم ہوا تو فرط اشتیاق میں حضورؐ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے، یا رسول اللہ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا: تم خدا کی نگاہ میں ناکارہ نہیں ہو"۔

......ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال کر حضرت علیؓ کے آگے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھالیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

......غزوۂ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ

خوب ہنسے اور آپؐ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیئے۔ ہوا یہ کہ عامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے۔ ایک دشمن فرزدوپ تھا۔ وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا۔ سعد کے تیر کاری نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں اس نے جونہی ڈھال سے سر نکالا تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہوگیا۔ اس بری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اوپر کو اٹھ گئیں۔

بعد میں لوگوں کو اس رنگ مزاج کا حال سن کر تعجب ہوتا تھا، کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور رضا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ روحانی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں۔ دوسرے حضورؐ کی عبادت رب، حضورؐ کی خشیت، حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نمونۂ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لئے زندگی کے نقشے میں

کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہ کے رفقاء بھی ہنسا کرتے تھے"؟ انہوں نے فرمایا: "ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل لگی، ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے"۔ (روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہؓ کے ساتھ رسول اکرمؐ بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپؐ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گذر چکا ہے۔

تفریحات

متوازن زندگی کا ایک لازمی جزو تفریحات (جائز حدود

میں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جزء ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظام حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لئے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپؐ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی رفقاء کے سات باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا ساتھی حضورؐ نے جناب ابوبکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہبند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنوئیں میں پاؤں لٹکا کے اس کے دہانے پر بیٹھتے۔ (شمائل ترمذی۔ (مختلف ابواب)

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے۔ ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گالیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں گانے دو۔ (روایت عائشہؓ (مسلم...... باب ما یقول الجواری فی العید)۔

شادی بیاہ کے لئے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے۔ (روایت عائشہؓ و محمد بن حاطب الجمحی) حضرت عائشہؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی۔ میں نے اس کا نکاح کر دیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا: "عائشہؓ! تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں حالانکہ قبیلہ انصار گانے کو پسند کرتا ہے"۔ ایک دوسری روایت میں (غالباً اسی موقعے سے متعلق) یہ آتا ہے کہ "تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتا" اتینا کم اتینا کم فحیانا و حیا کم" ۔ (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں) ایسی ہی ایک عروسی میں بچیاں کچھ گا رہی تھیں۔ حضرت عامر بن سعدؓ نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیان رسول! اے شرکائے بدر! تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے"؟ جواب ملا۔ جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ۔ ہمیں رسول اللہؐ نے اس کی اجازت دی

ہے''۔ (ملاحظہ ہو: مشکوۃ باب اعلان نکاح)

ازاں جملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی اس سے تو آپ کو بعد تھا۔ آپ کو نغمۂ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دوسری طرف ذوق شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظ مقصد) کی قدر فرماتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا اور ایک نیا معیار نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے۔ اور صحابہ شعر بھی سنایا کرتے۔ شاعران عرب کے کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرع پسندیدگی سے پڑھا:

"الا کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل"۔

(آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے)...... دوسرا مصرع ہے:

"وکل نعیم لا محالۃ زائل"۔

(دنیا کی ساری نعمتیں زائل ہونے والی ہیں)

حضرت شرید سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کرکر کے امیہ بن ابی صلت کے سو شعر سنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدان جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسانؓ اور کعبؓ بن مالک سے دشمنان اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسان کو اپنے میز پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں"۔ یہ بھی فرمایا کہ "مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی"۔ شعر وادب نیز دوسرے ثقافتی موضوعات پر ہم تفصیل

سے ایک علیحدہ مقالے میں بحث کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ حضورؐ نے انسانی ذوق کو کس تعمیری راستے پر ڈالا تھا۔

چند متفرق ذوقیات

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات و اطوار کا ذکر کرتے ہیں جنہیں کسی دوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جا سکا۔

.....کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے اور کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔

.....خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مہر لگواتے۔

.....حضورؐ اوہام پسندی سے پاک تھے۔ اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔

برے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لئے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنی شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔

...... سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے گھوڑے کے بال میں قیامت تک کے لئے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ، منھ، ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

...... شور ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی، ہر کام میں سکون، وقار اور نظم و ترتیب چاہتے۔ نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ۔ ''علیکم بالسکینۃ'' (تمہارے

لئے سکون ووقار لازم ہے) یوم عرفہ کو ہجوم تھا اور بڑا شوروہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم وسکون کا حکم دیا اور فرمایا "فان البر لیس بالا یضاع" (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)۔ (بخاری و مسلم)

اخلاق

حضورؐ پاک کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جا سکتا۔ وہاں تو پوری زندگی حسن اخلاق ہی کی تفسیر ہے جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا۔ "کان خلقه القرآن" انس بن مالک کا قول بہت ہی جامع ہے کہ "کان احسن الناس و کان اجود الناس و کان اشجع الناس" (باب شجاعة النبی صلی الله علیه وسلم، مسلم) احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی (ماسواء ان باتوں کے جو حکم الٰہی کے تحت تھیں)

اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر کسی سے عفو

فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بیدادگروں کو معاف کیا

اور منافقین واشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا

کہ جابرؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا۔ آپؐ

نے کبھی نہ نہیں کی۔ (باب ما سئل النبي صلى الله عليه

وسلم ......) (موجود ہوا تو دے دیا، کبھی قرض لے کر دیا۔

نہیں موجود ہوا تو دوسرے وقت آنے کو کہا یا سکوت اختیار کیا)

اشجع الناس ہونے کے لئے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریۂ

حق کو لے کر تن تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے

مقابلے میں جمے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی

خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غار ثور یا احد وحنین کے معرکے،

ہر موقع پر یقین محکم کا مظاہرہ کیا۔

❀❀❀